(۱۰)

یُونُس

نام اس سورہ کا نام حسبِ دستور محض علامت کے طور پر آیت ۹۸ سے لیا گیا ہے، جس میں اشارتاً حضرت یونسؑ کا ذکر آیا ہے۔ سورہ کا موضوعِ بحث حضرت یونُسؑ کا قصہ نہیں ہے۔

مقامِ نزُول رِوایات سے معلوم ہوتا ہے اور نفسِ مضمون سے اس کی تائید ہوتی ہے کہ یہ پوری سورت مکّے میں نازل ہوئی ہے۔ بعض لوگوں کا گمان ہے کہ اس کی بعض آیتیں مدنی دَور کی ہیں، لیکن یہ محض ایک سطحی قیاس ہے۔ سلسلۂ کلام پر غور کرنے سے صاف محسوس ہوجاتا ہے کہ یہ مختلف تقریروں یا مختلف مواقع پر اُتری ہوئی آیتوں کا مجموعہ نہیں ہے بلکہ شروع سے آخر تک ایک ہی مربوط تقریر ہے جو بیک وقت نازل ہوئی ہوگی، اور مضمونِ کلام اس بات پر صریح دلالت کر رہا ہے کہ یہ مکّی دَور کا کلام ہے۔

زمانۂ نزُول زمانۂ نزول کے متعلّق کوئی رِوایت ہمیں نہیں ملی۔ لیکن مضمون سے ایسا ہی ظاہر ہوتا ہے کہ یہ سورت زمانۂ قیامِ مکہ کے آخری دَور میں نازل ہوئی ہوگی۔ کیونکہ اس کے اندازِ کلام سے صریح طور پر محسوس ہوتا ہے کہ مخالفینِ دعوت کی طرف سے مزاحمت پوری شدت اختیار کر چکی ہے، وہ نبیؐ اور پیروانِ نبیؐ کو اپنے درمیان برداشت کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں، ان سے اب یہ اُمید باقی نہیں رہی ہے کہ تفہیم و تلقین سے راہِ راست پر آجائیں گے، اور اب انھیں اُس انجام سے خبردار کرنے کا موقع آ گیا ہے جو نبیؐ کو آخری اور قطعی طور پر ردّ کر دینے کی صورت میں انھیں لازماً دیکھنا ہوگا۔ مضمون کی یہی خُصوصیات ہمیں بتاتی ہیں کہ کون سی سورتیں مکہ کے آخری دَور سے تعلّق رکھتی ہیں۔ لیکن اس سورہ میں ہجرت کی طرف بھی کوئی اشارہ نہیں پایا جاتا، اس لیے اس کا زمانہ ان سورتوں سے پہلے کا سمجھنا چاہیے جن میں کوئی نہ کوئی خفی یا جلی اشارہ ہم کو ہجرت کے متعلّق ملتا ہے ـــــ زمانے کی اِس تعیین کے بعد تاریخی پَس منظر بیان کرنے کی ضرورت باقی نہیں رہتی، کیونکہ اس دَور کا تاریخی پَس منظر سورۂ اَنعام اور سورۂ اَعراف کے دیباچوں میں بیان کیا جا چکا ہے۔

موضوع موضوعِ تقریر دعوت، فہمایش اور تنبیہ ہے۔ کلام کا آغاز اس طرح ہوتا ہے کہ:

لوگ ایک انسان کے پیغامِ نبوت پیش کرنے پر حیران ہیں اور اِسے خواہ مخواہ ساحری کا الزام دے رہے ہیں، حالانکہ جو بات وہ پیش کر رہا ہے اس میں کوئی چیز بھی نہ تو عجیب ہی ہے اور نہ سِحر و کہانت ہی سے تعلّق رکھتی ہے۔ وہ تو دو اہم حقیقتوں سے تم کو آگاہ کر رہا ہے: ایک یہ کہ جو خدا اس کائنات کا خالق ہے اور اس کا انتظام عملاً چلا رہا ہے، صرف وہی تمھارا مالک و آقا ہے اور تنہا اسی کا یہ حق ہے کہ تم اس کی بندگی کرو۔

دوسرے یہ کہ موجودہ دنیوی زندگی کے بعد زندگی کا ایک اور دَور آنے والا ہے جس میں تم دوبارہ پیدا کیے جاؤ گے، اپنی موجودہ زندگی کے پورے کارنامے کا حساب دو گے اور اس بنیادی سوال پر جزا یا سزا پاؤ گے کہ تم نے اُسی خدا کو اپنا آقا مان کر اس کے منشا کے مطابق نیک رَوِیَّہ اختیار کیا یا اس کے خلاف عمل کرتے رہے۔ یہ دونوں حقیقتیں، جو وہ تمھارے سامنے پیش کر رہا ہے، بجائے خود امرِ واقعی ہیں، خواہ تم مانو یا نہ مانو۔ وہ تمھیں دعوت دیتا ہے کہ تم انھیں مان لو اور اپنی زندگی کو ان کے مطابق بنالو۔ اس کی یہ دعوت اگر تم قبول کرو گے تو تمھارا اپنا انجام بہتر ہوگا، ورنہ خود ہی بُرا نتیجہ دیکھو گے۔

مَباحِث اس تمہید کے بعد حسبِ ذیل مَباحِث ایک خاص ترتیب کے ساتھ سامنے آتے ہیں:

(۱) وہ دلائل جو توحیدِ رُبوبیّت اور حیاتِ اُخروی کے باب میں ایسے لوگوں کو عقل وضمیر کا اطمینان بخش سکتے ہیں جو جاہلانہ تعصُّب میں مبتلا نہ ہوں اور جنھیں بحث کی ہار جیت کے بجائے اصل فکر اس بات کی ہو کہ خود غلط بِینی اور اس کے بُرے نتائج سے بچیں۔

(۲) اُن غلط فہمیوں کا ازالہ اور اُن غفلتوں پر تنبیہ جو لوگوں کو توحید اور آخرت کا عقیدہ تسلیم کرنے میں مانع ہو رہی تھیں (اور ہمیشہ ہُوا کرتی ہیں)۔

(۳) اُن شبہات اور اعتراضات کا جواب جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت اور آپؐ کے لائے ہوئے پیغام کے بارے میں پیش کیے جاتے تھے۔

(۴) دوسری زندگی میں جو کچھ پیش آنے والا ہے اس کی پیشگی خبر، تاکہ انسان اس سے ہوشیار ہو کر اپنے آج کے طرزِ عمل کو دُرست کرلے اور بعد میں پچھتانے کی نوبت نہ آئے۔

(۵) اس امر پر تنبیہ کہ دنیا کی موجودہ زندگی دراصل امتحان کی زندگی ہے اور اس امتحان کے لیے تمھارے پاس بس اتنی ہی مہلت ہے جب تک تم اس دنیا میں سانس لے رہے ہو۔ اِس وقت کو اگر تم نے ضائع کر دیا اور نبی کی ہدایت قبول کر کے امتحان کی کامیابی کا سامان نہ کیا تو پھر کوئی دوسرا موقع تمہیں ملنا نہیں ہے۔ اس نبی کا آنا اور اس قرآن کے ذریعے سے تم کو علمِ حقیقت کا بہم پہنچایا جانا وہ بہترین اور ایک ہی موقع ہے جو تمھیں مل رہا ہے۔ اس سے فائدہ نہ اٹھاؤ گے تو بعد کی اَبدی زندگی میں ہمیشہ ہمیشہ پچھتاؤ گے۔

(۶) اُن کھلی کھلی جہالتوں اور ضلالتوں پر اشارہ جو لوگوں کی زندگی میں صرف اس وجہ سے پائی جا رہی تھیں کہ وہ خدائی ہدایت کے بغیر جی رہے تھے۔

اس سلسلے میں نوح علیہ السلام کا قصہ مختصراً اور موسیٰ علیہ السلام کا قصہ ذرا تفصیل کے ساتھ بیان کیا گیا ہے، جس سے چار باتیں ذہن نشین کرنی مطلوب ہیں: اوّل یہ کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ جو معاملہ تم لوگ کر رہے ہو، وہ اس سے ملتا جلتا ہے جو نوح اور موسیٰ علیہما السلام کے ساتھ تمھارے پیش رَو کر چکے ہیں، اور یقین رکھو کہ اس طرزِ عمل کا جو انجام وہ دیکھ چکے ہیں وہی تمھیں بھی دیکھنا پڑے گا۔ دوم یہ کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور

ان کے ساتھیوں کو آج جس بے بسی و کمزوری کے حال میں تم دیکھ رہے ہو، اس سے کہیں یہ نہ سمجھ لینا کہ صورتِ حال ہمیشہ یہی رہے گی۔ تمھیں خبر نہیں ہے کہ ان لوگوں کی پشت پر وہی خدا ہے جو موسیٰؑ و ہارونؑ کی پشت پر تھا، اور وہ ایسے طریقے سے حالات کی بساط اُلٹ دیتا ہے جس تک کسی کی نگاہ نہیں پہنچ سکتی۔ سوم یہ کہ سنبھلنے کے لیے جو مہلت خدا تمھیں دے رہا ہے، اسے اگر تم نے ضائع کر دیا اور پھر فرعون کی طرح خدا کی پکڑ میں آ جانے کے بعد عین آخری لمحے پر توبہ کی تو معاف نہیں کیے جاؤ گے۔ چہارم یہ کہ جو لوگ محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لائے تھے وہ مخالف ماحول کی انتہائی شدت اور اس کے مقابلے میں اپنی بیچارگی دیکھ کر مایوس نہ ہوں اور انھیں معلوم ہو کہ ان حالات میں ان کو کس طرح کام کرنا چاہیے۔ نیز وہ اس امر پر بھی متنبہ ہو جائیں کہ جب اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے ان کو اِس حالت سے نکال دے تو کہیں وہ اُس رَوِش پر نہ چل پڑیں جو بنی اسرائیل نے مصر سے نجات پا کر اختیار کی۔

آخر میں اعلان کیا گیا ہے کہ یہ عقیدہ اور یہ مسلک ہے جس پر چلنے کی اللہ نے اپنے پیغمبر کو ہدایت کی ہے، اس میں قطعاً کوئی ترمیم نہیں کی جا سکتی، جو اسے قبول کرے گا وہ اپنا بھلا کرے گا اور جو اس کو چھوڑ کر غلط راہوں میں بھٹکے گا وہ اپنا ہی کچھ بگاڑے گا۔

الٓرٰ ۚ تِلۡکَ اٰیٰتُ الۡکِتٰبِ الۡحَکِیۡمِ ﴿۱﴾ اَکَانَ لِلنَّاسِ عَجَبًا اَنۡ اَوۡحَیۡنَاۤ اِلٰی رَجُلٍ مِّنۡہُمۡ اَنۡ اَنۡذِرِ النَّاسَ وَبَشِّرِ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡۤا اَنَّ لَہُمۡ قَدَمَ صِدۡقٍ عِنۡدَ رَبِّہِمۡ ؕؔ قَالَ الۡکٰفِرُوۡنَ اِنَّ ہٰذَا لَسٰحِرٌ مُّبِیۡنٌ ﴿۲﴾

المنزل ۳

وقف النبی صلی اللہ علیہ وسلم

ال ر، یہ اُس کتاب کی آیات ہیں جو حکمت و دانش سے لبریز ہے۔[1]

کیا لوگوں کے لیے یہ ایک عجیب بات ہوگئی کہ ہم نے خود انھی میں سے ایک آدمی کو اشارہ کیا کہ (غفلت میں پڑے ہوئے) لوگوں کو چونکا دے اور جو مان لیں ان کو خوش خبری دے دے کہ ان کے لیے اُن کے رب کے پاس سچّی عزت و سرفرازی ہے؟[2] (کیا یہی وہ بات ہے جس پر) منکرین نے کہا کہ یہ شخص تو کُھلا جادوگر ہے؟[3]

۱ — اس تمہیدی فقرے میں ایک لطیف تنبیہ مضمر ہے۔ نادان لوگ یہ سمجھ رہے تھے کہ پیغمبر قرآن کے نام سے جو کلام ان کو سنا رہا ہے وہ محض زبان کی جادوگری ہے، شاعرانہ پروازِ تخیّل ہے اور کچھ کاہنوں کی طرح عالمِ بالا کی گفتگو ہے۔ اس پر انھیں متنبّہ کیا جا رہا ہے کہ جو کچھ تم گمان کر رہے ہو یہ وہ چیز نہیں ہے۔ یہ تو کتابِ حکیم کی آیات ہیں۔ اِن کی طرف توجہ نہ کرو گے تو حکمت سے محروم رہ جاؤ گے۔

۲ — یعنی آخر اس میں تعجب کی بات کیا ہے؟ انسانوں کو ہوشیار کرنے کے لیے انسان نہ مقرر کیا جاتا تو کیا فرشتہ یا جن یا حیوان مقرر کیا جاتا؟ اور اگر انسان حقیقت سے غافل ہو کر غلط طریقے سے زندگی بسر کر رہے ہوں تو تعجب کی بات یہ ہے کہ ان کا خالق و پروردگار انھیں ان کے حال پر چھوڑ دے، یا یہ کہ وہ ان کی ہدایت و رہنمائی کے لیے کوئی انتظام کرے؟ اور اگر خدا کی طرف سے کوئی ہدایت آئے تو عزت و سرفرازی اُن کے لیے ہونی چاہیے جو اسے مان لیں یا ان کے لیے جو اسے ردّ کر دیں؟ پس تعجب کرنے والوں کو سوچنا تو چاہیے کہ آخر وہ بات کیا ہے جس پر وہ تعجب کر رہے ہیں۔

۳ — یعنی جادوگر کی پھبتی تو انھوں نے اس پر کَس دی مگر یہ نہ سوچا کہ وہ چسپاں بھی ہوتی ہے یا نہیں۔ صرف یہ بات کہ کوئی شخص اعلیٰ درجے کی خطابت سے کام لے کر دلوں اور دماغوں کو مسخّر کر رہا ہے، اُس پر یہ الزام عائد کر دینے کے لیے تو کافی نہیں ہو سکتی کہ وہ جادوگری کر رہا ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ اس خطابت میں وہ بات کیا کہتا ہے، کس غرض کے لیے قوتِ تقریر کو استعمال کر رہا ہے، اور جو اثرات اس کی تقریر سے ایمان لانے والوں کی زندگی پر مترتّب ہو رہے ہیں وہ کس نوعیت کے ہیں۔ جو خطیب کسی ناجائز

إِنَّ رَبَّكُمُ اللَّهُ الَّذِي خَلَقَ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ فِي سِتَّةِ أَيَّامٍ ثُمَّ اسْتَوَىٰ عَلَى الْعَرْشِ ۖ يُدَبِّرُ الْأَمْرَ ۖ مَا مِن شَفِيعٍ إِلَّا مِن بَعْدِ إِذْنِهِ ۚ ذَٰلِكُمُ اللَّهُ رَبُّكُمْ فَاعْبُدُوهُ ۚ أَفَلَا تَذَكَّرُونَ ﴿٣﴾

حقیقت یہ ہے کہ تمھارا رب وہی خدا ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو چھ دنوں میں پیدا کیا، پھر تختِ حکومت پر جلوہ گر ہوا اور کائنات کا انتظام چلا رہا ہے[۴]۔ کوئی شفاعت (سفارش) کرنے والا نہیں ہے اِلّا یہ کہ اس کی اجازت کے بعد شفاعت کرے[۵]۔ یہی اللہ تمھارا رب ہے، لٰہذا تم اُسی کی عبادت کرو[۶]۔ پھر کیا تم ہوش میں نہ آوٴ گے[۷]؟

غرض کے لیے جادو بیانی کی طاقت استعمال کرتا ہے، وہ تو ایک منہ پھٹ، بے لگام، غیر ذمہ دار مقرر ہوتا ہے۔ حق اور صداقت اور انصاف سے آزاد ہو کر ہر وہ بات کہہ ڈالتا ہے جو بس سننے والوں کو متأثر کر دے، خواہ بجائے خود کتنی ہی جھوٹی، مبالغہ آمیز اور غیر منصفانہ ہو۔ اس کی باتوں میں حکمت کے بجائے عوام فریبی ہوتی ہے۔ کسی منظّم فکر کے بجائے تناقض اور ناہمواری ہوتی ہے۔ اعتدال کے بجائے بے اعتدالی ہُوا کرتی ہے۔ وہ تو محض اپنا سکّہ جمانے کے لیے زبان درازی کرتا ہے یا پھر لوگوں کو لڑانے اور ایک گروہ کو دوسرے کے مقابلے میں اُبھارنے کے لیے خطابت کی شراب پلاتا ہے۔ اس کے اثر سے لوگوں میں نہ کوئی اخلاقی بلندی پیدا ہوتی ہے، نہ ان کی زندگیوں میں کوئی مفید تغیُّر رُونما ہوتا ہے اور نہ کوئی صالح فکر یا صالح عملی حالت وجود میں آتی ہے، بلکہ لوگ پہلے سے بدتر صفات کا مظاہرہ کرنے لگتے ہیں۔ مگر یہاں تم دیکھ رہے ہو کہ پیغمبر جو کلام پیش کر رہا ہے اس میں حکمت ہے، ایک متناسب نظامِ فکر ہے، غایت درجے کا اعتدال اور حق وصداقت کا سخت التزام ہے، لفظ لفظ نَپا تُلا اور بات بات کانٹے کی تول پوری ہے۔ اس کی خطابت میں تم خلقِ خدا کی اصلاح کے سوا کسی دوسری غرض کی نشان دِہی نہیں کر سکتے۔ جو کچھ وہ کہتا ہے اس میں اس کی اپنی ذاتی یا خاندانی یا قومی یا کسی قسم کی دنیوی غرض کا کوئی شائبہ نہیں پایا جاتا۔ وہ صرف یہ چاہتا ہے کہ لوگ جس غفلت میں پڑے ہوئے ہیں اس کے بُرے نتائج سے ان کو خبردار کرے اور انھیں اُس طریقے کی طرف بلائے جس میں ان کا اپنا بھلا ہے۔ پھر اس کی تقریر سے جو اثرات مُترتّب ہوئے ہیں وہ بھی جادوگروں کے اثرات سے بالکل مختلف ہیں۔ یہاں جس نے بھی اس کا اثر قبول کیا ہے، اس کی زندگی سنور گئی ہے، وہ پہلے سے زیادہ بہتر اخلاق کا انسان بن گیا ہے اور اس کے سارے طرزِ عمل میں خیر وصلاح کی شان نمایاں ہو گئی ہے۔ اب تم خود ہی سوچ لو، کیا جادوگر ایسی ہی باتیں کرتے ہیں اور ان کا جادو ایسے ہی نتائج دکھایا کرتا ہے؟

۴ — یعنی پیدا کر کے وہ معطل نہیں ہو گیا بلکہ اپنی پیدا کی ہوئی کائنات کے تختِ سلطنت پر وہ خود جلوہ فرما ہُوا اور اب سارے جہان کا انتظام عملاً اسی کے ہاتھ میں ہے۔ نادان لوگ سمجھتے ہیں خدا نے کائنات کو پیدا کر کے یونہی چھوڑ دیا ہے کہ خود جس طرح چاہے چلتی رہے، یا دوسروں کے حوالے کر دیا ہے کہ وہ اس میں جیسا چاہیں تصرُّف کریں۔ قرآن اس کے برعکس یہ حقیقت پیش کرتا ہے

إِلَيْهِ مَرْجِعُكُمْ جَمِيعًا ۖ وَعْدَ اللَّهِ حَقًّا ۚ إِنَّهُ يَبْدَؤُا الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيدُهُ لِيَجْزِيَ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ بِالْقِسْطِ ۚ وَالَّذِينَ كَفَرُوا لَهُمْ شَرَابٌ مِّنْ حَمِيمٍ وَعَذَابٌ أَلِيمٌ بِمَا كَانُوا يَكْفُرُونَ ﴿۴﴾

اسی کی طرف تم سب کو پلٹ کر جانا ہے[8]، یہ اللہ کا پکا وعدہ ہے۔ بے شک پیدایش کی ابتدا وہی کرتا ہے، پھر وہی دوبارہ پیدا کرے گا[9]، تاکہ جو لوگ ایمان لائے اور جنھوں نے نیک اعمال کیے ان کو پورے انصاف کے ساتھ جزا دے، اور جنھوں نے کفر کا طریقہ اختیار کیا وہ کھولتا ہُوا پانی پییں اور دردناک سزا بھگتیں اُس انکارِ حق کی پاداش میں جو وہ کرتے رہے[10]۔

کہ اللہ تعالیٰ اپنی تخلیق کی اس پوری کارگاہ پر آپ ہی حکمرانی کر رہا ہے، تمام اختیارات اس کے اپنے ہاتھ میں ہیں، ساری زمامِ اقتدار پر وہ خود قابض ہے، کائنات کے گوشے گوشے میں ہر وقت ہر آن جو کچھ ہو رہا ہے، براہِ راست اس کے حکم یا اذن سے ہو رہا ہے، اس جہانِ ہستی کے ساتھ اس کا تعلق صرف اتنا ہی نہیں ہے کہ وہ کبھی اسے وجود میں لایا تھا، بلکہ ہمہ وقت وہی اس کا مدبر و منتظم ہے، اسی کے قائم رکھنے سے یہ قائم ہے اور اسی کے چلانے سے یہ چل رہا ہے۔ (مُلاحظہ ہو: سورۂ اَعراف، حاشیہ ۴۰ و ۴۱)

۵ — یعنی دنیا کی تدبیر و انتظام میں کسی دوسرے کا دخیل ہونا تو درکنار، کوئی اتنا اختیار بھی نہیں رکھتا کہ خدا سے سفارش کر کے اس کا کوئی فیصلہ بدلوا دے یا کسی کی قسمت بنوا دے یا بگڑوا دے۔ زیادہ سے زیادہ کوئی جو کچھ کر سکتا ہے وہ بس اتنا ہے کہ خدا سے دعا کرے، مگر اس کی دعا کا قبول ہونا یا نہ ہونا بالکل خدا کی مرضی پر منحصر ہے۔ خدا کی خدائی میں اتنا زوردار کوئی نہیں ہے کہ اس کی بات چل کر رہے اور اس کی سفارش ٹل نہ سکے اور وہ عرش کا پایہ پکڑ کر بیٹھ جائے اور اپنی بات منوا کر ہی رہے۔

۶ — اُوپر کے تین فقروں میں حقیقتِ نفس الامری کا بیان تھا کہ فی الواقع خدا ہی تمھارا رب ہے۔ اب یہ بتایا جا رہا ہے کہ اس امرِ واقعی کی موجودگی میں تمھارا طرزِ عمل کیا ہونا چاہیے۔ جب واقعہ یہ ہے کہ رُبُوبیّت بالکُلّیّہ خدا کی ہے تو اس کا لازمی تقاضا یہ ہے کہ تم صرف اُسی کی عبادت کرو۔ پھر جس طرح رُبُوبیّت کا لفظ تین مفہومات پر مشتمل ہے، یعنی پرورد گاری، مالکی و آقائی اور فرماں روائی، اسی طرح اس کے بالمقابل عبادت کا لفظ بھی تین مفہومات پر مشتمل ہے، یعنی پرستش، غلامی اور اطاعت۔

خدا کے واحد پروردگار ہونے سے لازم آتا ہے کہ انسان اسی کا شکر گزار ہو، اسی سے دعائیں مانگے اور اسی کے آگے محبّت و عقیدت سے سر جھکائے۔ یہ عبادت کا پہلا مفہوم ہے۔

خدا کے واحد مالک و آقا ہونے سے لازم آتا ہے کہ انسان اس کا بندہ و غلام بن کر رہے، اُس کے مقابلے میں خود مختارانہ رَوِیّہ نہ اختیار کرے اور اس کے سوا کسی اور کی ذہنی یا عملی غلامی قبول نہ کرے۔ یہ عبادت کا دوسرا مفہوم ہے۔

خدا کے واحد فرماں روا ہونے سے لازم آتا ہے کہ انسان اس کے حکم کی اطاعت اور اس کے قانون کی پیروی کرے۔

هُوَ الَّذِیْ جَعَلَ الشَّمْسَ ضِیَآءً وَّ الْقَمَرَ نُوْرًا وَّ قَدَّرَهٗ مَنَازِلَ لِتَعْلَمُوْا عَدَدَ السِّنِیْنَ وَ الْحِسَابَ ؕ مَا خَلَقَ اللّٰهُ ذٰلِكَ اِلَّا بِالْحَقِّ ۚ یُفَصِّلُ الْاٰیٰتِ لِقَوْمٍ یَّعْلَمُوْنَ ۝۵ اِنَّ فِی اخْتِلَافِ الَّیْلِ وَ النَّهَارِ وَ مَا خَلَقَ اللّٰهُ فِی السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّتَّقُوْنَ ۝۶

وہی ہے جس نے سُورج کو اُجیالا بنایا اور چاند کو چمک دی اور چاند کے گھٹنے بڑھنے کی منزلیں ٹھیک ٹھیک مقرر کر دیں، تاکہ تم اُس سے برسوں اور تاریخوں کے حساب معلوم کرو۔ اللہ نے یہ سب کچھ (کھیل کے طور پر نہیں بلکہ) بامقصد ہی بنایا ہے۔ وہ اپنی نشانیوں کو کھول کھول کر پیش کر رہا ہے اُن لوگوں کے لیے جو علم رکھتے ہیں۔ یقیناً رات اور دن کے اُلٹ پھیر میں اور ہر اُس چیز میں جو اللہ نے زمین اور آسمانوں میں پیدا کی ہے، نشانیاں ہیں اُن لوگوں کے لیے جو (غلط بینی و غلط رَوی سے) بچنا چاہتے ہیں۔[11]

نہ خود اپنا حکمراں بنے اور نہ اس کے سوا کسی دوسرے کی حاکمیّت تسلیم کرے۔ یہ عبادت کا تیسرا مفہوم ہے۔

۷ – یعنی جب یہ حقیقت تمھارے سامنے کھول دی گئی ہے اور تم کو صاف صاف بتا دیا گیا ہے کہ اس حقیقت کی موجودگی میں تمھارے لیے صحیح طرزِ عمل کیا ہے، تو کیا اب بھی تمھاری آنکھیں نہ کھلیں گی اور اُنھی غلط فہمیوں میں پڑے رہو گے جن کی بنا پر تمھاری زندگی کا پورا رَویّہ اب تک حقیقت کے خلاف رہا ہے؟

۸ – یہ نبیؐ کی تعلیم کا دوسرا بنیادی اُصول ہے۔ اصلِ اوّل یہ کہ تمھارا رب صرف اللہ ہے لہٰذا اسی کی عبادت کرو۔ اور اصلِ دوم یہ کہ تمھیں اس دنیا سے واپس جا کر اپنے رب کو حساب دینا ہے۔

۹ – یہ فقرہ دعوے اور دلیل دونوں کا مجموعہ ہے۔ دعویٰ یہ ہے کہ خدا دوبارہ انسان کو پیدا کرے گا، اور اس پر دلیل یہ دی گئی ہے کہ اسی نے پہلی مرتبہ انسان کو پیدا کیا۔ جو شخص یہ تسلیم کرتا ہو کہ خدا نے خلق کی ابتدا کی ہے (اور اس سے بجز اُن دہریّوں کے جو محض پادریوں کے مذہب سے بھاگنے کے لیے خلقِ بے خالق جیسے احمقانہ نظریّے کو اوڑھنے پر آمادہ ہو گئے، اور کون انکار کر سکتا ہے) وہ اس بات کو ناممکن یا بعید از فہم قرار نہیں دے سکتا کہ وہی خدا اس خلق کا پھر اعادہ کرے گا۔

۱۰ – یہ وہ ضرورت ہے جس کی بنا پر اللہ تعالیٰ انسان کو دوبارہ پیدا کرے گا۔ اُوپر جو دلیل دی گئی وہ یہ بات ثابت کرنے کے لیے کافی تھی کہ خلق کا اعادہ ممکن ہے اور اسے مُستبعَد سمجھنا درست نہیں ہے۔ اب یہ بتایا جا رہا ہے کہ یہ اعادۂ خلق، عقل و انصاف کی رُو سے ضروری ہے اور یہ ضرورت تخلیقِ ثانیہ کے سوا کسی دوسرے طریقے سے پوری نہیں ہو سکتی۔ خدا کو اپنا واحد رب مان کر جو لوگ صحیح بندگی کا رَویّہ اختیار کریں وہ اس کے مستحق ہیں کہ انھیں اپنے اس بجا طرزِ عمل کی پوری پوری جزا ملے۔ اور جو لوگ حقیقت سے

انکار کر کے اس کے خلاف زندگی بسر کریں وہ بھی اس کے مستحق ہیں کہ وہ اپنے اس بے جا طرزِ عمل کا بُرا نتیجہ دیکھیں۔ یہ ضرورت اگر موجودہ دنیوی زندگی میں پوری نہیں ہو رہی ہے (اور ہر شخص جو ہٹ دھرم نہیں ہے جانتا ہے کہ نہیں ہو رہی ہے) تو اسے پورا کرنے کے لیے یقیناً دوبارہ زندگی ناگزیر ہے۔ (مزید تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: سورۂ اَعراف، حاشیہ ۳۰ و سورۂ ہُود، حاشیہ ۱۰۵)

۱۱ – یہ عقیدۂ آخرت کی تیسری دلیل ہے۔ کائنات میں اللہ تعالیٰ کے جو کام ہر طرف نظر آ رہے ہیں، جن کے بڑے بڑے نشانات سُورج اور چاند، اور لَیل و نہار کی گردش کی صورت میں ہر شخص کے سامنے موجود ہیں، ان سے اس بات کا نہایت واضح ثبوت ملتا ہے کہ اس عظیم الشان کارگاہِ ہستی کا خالق کوئی بچہ نہیں ہے، جس نے محض کھیلنے کے لیے یہ سب کچھ بنایا ہو اور پھر دل بھر لینے کے بعد یونہی اس گھروندے کو توڑ پھوڑ ڈالے۔ صریح طور پر نظر آ رہا ہے کہ اس کے ہر کام میں نظم ہے، حکمت ہے، مَصلحتیں ہیں، اور ذرّے ذرّے کی پیدایش میں ایک گہری مقصدیّت پائی جاتی ہے۔ پس جب وہ حکیم ہے اور اس کی حکمت کے آثار و علائم تمھارے سامنے عَلانیہ موجود ہیں، تو اس سے تم کیسے یہ توقع رکھتے ہو کہ وہ انسان کو عقل اور اخلاقی حس اور آزادانہ ذمّہ داری اور تصرُّف کے اختیارات بخشنے کے بعد اس کے کارنامۂ زندگی کا حساب کبھی نہ لے گا اور عقلی و اخلاقی ذمّہ داری کی بنا پر جزا و سزا کا جو استحقاق لازماً پیدا ہوتا ہے اسے یونہی مُہمَل چھوڑ دے گا۔

اس طرح ان آیات میں عقیدۂ آخرت پیش کرنے کے ساتھ اس کی تین دلیلیں ٹھیک ٹھیک منطقی ترتیب کے ساتھ دی گئی ہیں:

اوّل یہ کہ دوسری زندگی ممکن ہے، کیونکہ پہلی زندگی کا امکان واقعے کی صورت میں موجود ہے۔

دوم یہ کہ دوسری زندگی کی ضرورت ہے، کیونکہ موجودہ زندگی میں انسان اپنی اخلاقی ذمّہ داری کو صحیح یا غلط طور پر جس طرح ادا کرتا ہے اور اس سے سزا اور جزا کا جو استحقاق پیدا ہوتا ہے، اس کی بنا پر عقل اور انصاف کا تقاضا یہی ہے کہ ایک اور زندگی ہو جس میں ہر شخص اپنے اخلاقی رَوِیّے کا وہ نتیجہ دیکھے جس کا وہ مستحق ہے۔

سوم یہ کہ جب عقل و انصاف کی رُو سے دوسری زندگی کی ضرورت ہے تو یہ ضرورت یقیناً پوری کی جائے گی، کیونکہ انسان اور کائنات کا خالق حکیم ہے اور حکیم سے یہ توقع نہیں کی جا سکتی کہ حکمت و انصاف جس چیز کے متقاضی ہوں اسے وہ وجود میں لانے سے باز رہ جائے۔

غور سے دیکھا جائے تو معلوم ہو گا کہ زندگی بعدِ موت کو اِستِدلال سے ثابت کرنے کے لیے یہی تین دلیلیں ممکن ہیں اور یہی کافی بھی ہیں۔ ان دلیلوں کے بعد اگر کسی چیز کی کسر باقی رہ جاتی ہے تو وہ صرف یہ ہے کہ انسان کو آنکھوں سے دکھا دیا جائے کہ جو چیز ممکن ہے، جس کے وجود میں آنے کی ضرورت بھی ہے، اور جس کو وجود میں لانا خدا کی حکمت کا تقاضا بھی ہے، وہ دیکھ، یہ تیرے سامنے موجود ہے۔ لیکن یہ کسر بہر حال موجودہ دنیوی زندگی میں پوری نہیں کی جائے گی، کیونکہ دیکھ کر ایمان لانا کوئی معنیٰ نہیں رکھتا۔ اللہ تعالیٰ انسان کا جو امتحان لینا چاہتا ہے وہ تو ہے ہی یہ کہ وہ حس اور مشاہدے سے بالاتر حقیقتوں کو خالص نظر و فکر اور استدلالِ صحیح کے ذریعے سے مانتا ہے یا نہیں۔

اس سلسلے میں ایک اور اہم مضمون بھی بیان فرما دیا گیا ہے جو گہری توجہ کا مستحق ہے۔ فرمایا کہ ”اللہ اپنی نشانیوں کو کھول کھول کر پیش کر رہا ہے اُن لوگوں کے لیے جو علم رکھتے ہیں“ اور ”اللہ کی پیدا کی ہوئی ہر چیز میں نشانیاں ہیں اُن لوگوں کے لیے جو غلط بینی و غلط رَوِی سے بچنا چاہتے ہیں“۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے نہایت حکیمانہ طریقے سے زندگی کے مظاہر میں ہر طرف وہ آثار پھیلا رکھے ہیں جو ان مظاہر کے پیچھے چُھپی ہوئی حقیقتوں کی صاف صاف نشان دہی کر رہے ہیں۔ لیکن ان نشانات سے حقیقت تک صرف وہ لوگ رسائی حاصل کر سکتے ہیں جن کے اندر یہ دو صفات موجود ہوں:

اِنَّ الَّذِيْنَ لَا يَرْجُوْنَ لِقَآءَنَا وَرَضُوْا بِالْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَ اطْمَاَنُّوْا بِهَا وَالَّذِيْنَ هُمْ عَنْ اٰيٰتِنَا غٰفِلُوْنَ ۝۷ اُولٰٓئِكَ مَاْوٰىهُمُ النَّارُ بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ۝۸ اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ

حقیقت یہ ہے کہ جو لوگ ہم سے ملنے کی توقع نہیں رکھتے اور دُنیا کی زندگی ہی پر راضی اور مطمئن ہو گئے ہیں، اور جو لوگ ہماری نشانیوں سے غافل ہیں، اُن کا آخری ٹھکانا جہنّم ہو گا اُن بُرائیوں کی پاداش میں جن کا اکتساب وہ (اپنے اس غلط عقیدے اور غلط طرزِ عمل کی وجہ سے) کرتے رہے۔[12]
اور یہ بھی حقیقت ہے کہ جو لوگ ایمان لائے (یعنی جنھوں نے اُن صداقتوں کو قبول کرلیا جو اس

ایک یہ کہ وہ جاہلانہ تعصّبات سے پاک ہو کر علم حاصل کرنے کے اُن ذرائع سے کام لیں جو اللہ نے انسان کو دیے ہیں۔ دوسرے یہ کہ اُن کے اندر خود یہ خواہش موجود ہو کہ غلطی سے بچیں اور صحیح راستہ اختیار کریں۔

۱۲ – یہاں پھر دعوے کے ساتھ ساتھ اس کی دلیل بھی اشارتاً بیان کر دی گئی ہے۔ دعویٰ یہ ہے کہ عقیدۂ آخرت کے انکار کا لازمی اور قطعی نتیجہ جہنّم ہے، اور دلیل یہ ہے کہ اس عقیدے سے منکر یا خالی الذہن ہو کر انسان اُن برائیوں کا اکتساب کرتا ہے جن کی سزا جہنم کے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتی۔ یہ ایک حقیقت ہے اور ہزار ہا سال کے انسانی رَوِیّے کا تجربہ اس پر شاہد ہے۔ جو لوگ خدا کے سامنے اپنے آپ کو ذمّہ دار اور جواب دہ نہیں سمجھتے، جو اس بات کا کوئی اندیشہ نہیں رکھتے کہ انھیں آخرِ کار خدا کو اپنے پورے کارنامۂ حیات کا حساب دینا ہے، جو اس مفروضے پر کام کرتے ہیں کہ زندگی بس یہی دُنیا کی زندگی ہے، جن کے نزدیک کامیابی و ناکامی کا معیار صرف یہ ہے کہ اس دنیا میں آدمی نے کس قدر خوش حالی، آسایش، شہرت اور طاقت حاصل کی، اور جو اپنے انھی مادّہ پرستانہ تخیّلات کی بنا پر آیاتِ الٰہی کو ناقابلِ توجہ سمجھتے ہیں، ان کی پوری زندگی غلط ہو کر رہ جاتی ہے۔ وہ دُنیا میں شُترِ بے مہار بن کر رہتے ہیں، نہایت بُرے اخلاق و اوصاف کا اکتساب کرتے ہیں، خدا کی زمین کو ظلم و فساد اور فِسق و فُجور سے بھر دیتے ہیں، اور اس بنا پر جہنم کے مستحق بن جاتے ہیں۔

یہ عقیدۂ آخرت پر ایک اور نوعیت کی دلیل ہے۔ پہلی تین دلیلیں عقلی اِستِدلال کے قبیل سے تھیں، اور یہ تجرِبی استدلال کے قبیل سے ہے۔ یہاں اسے صرف اشارتاً بیان کیا گیا ہے، مگر قرآن میں مختلف مواقع پر ہمیں اس کی تفصیل ملتی ہے۔ اس استدلال کا خلاصہ یہ ہے کہ انسان کا انفرادی رَوِیّہ اور انسانی گروہوں کا اجتماعی رَوِیّہ کبھی اُس وقت تک دُرست نہیں ہوتا جب تک یہ شُعور اور یہ یقین انسانی سیرت کی بنیاد میں پیوست نہ ہو کہ ہم کو خدا کے سامنے اپنے اعمال کا جواب دینا ہے۔ اب غور طلب بات یہ ہے کہ آخر ایسا کیوں ہے؟ کیا وجہ ہے کہ اس شعور و یقین کے غائب یا کمزور ہوتے ہی انسانی سیرت و کردار کی گاڑی بُرائی کی راہ پر چل پڑتی ہے۔ اگر عقیدۂ آخرت حقیقتِ نفس الامری کے مطابق نہ ہوتا اور اُس کا انکار حقیقت کے خلاف نہ ہوتا تو ممکن نہ تھا کہ اس اقرار و انکار کے یہ نتائج ایک لُزومی شان کے ساتھ مسلسل ہمارے تجرِبے میں آتے۔ ایک ہی چیز سے پیہم صحیح نتائج کا برآمد ہونا اور اس کے عَدَم سے

نتائج کا ہمیشہ غلط ہو جانا اس بات کا قطعی ثبوت ہے کہ وہ چیز بجائے خود صحیح ہے۔

اس کے جواب میں بسا اوقات یہ دلیل پیش کی جاتی ہے کہ بہت سے منکرینِ آخرت ایسے ہیں جن کا فلسفۂ اَخلاق اور دستورِ عمل سراسر دہریّت و مادّہ پرستی پر مبنی ہے پھر بھی وہ اچھی خاصی پاک سیرت رکھتے ہیں اور ان سے ظلم و فساد اور فِسق و فُجور کا ظہور نہیں ہوتا۔ بلکہ وہ اپنے معاملات میں نیک اور خلقِ خدا کے خدمت گزار ہوتے ہیں۔ لیکن اس استدلال کی کمزوری بادنیٰ تأمّل واضح ہو جاتی ہے۔ تمام مادّہ پرستانہ لادینی فلسفوں اور نظاماتِ فکر کی جانچ پڑتال کر کے دیکھ لیا جائے۔ کہیں اُن اَخلاقی خوبیوں اور عملی نیکیوں کے لیے کوئی بنیاد نہ ملے گی جن کا خراجِ تحسین ان ''نیکوکار'' دہریوں کو دیا جاتا ہے۔ کسی مَنْطِق سے یہ ثابت نہیں کیا جا سکتا کہ ان لادینی فلسفوں میں راست بازی، امانت، دیانت، وفائے عہد، عدل، رحم، فیاضی، ایثار، ہمدردی، ضبطِ نفس، عِفّت، حق شناسی اور ادائے حُقوق کے لیے مُحرّکات موجود ہیں۔ خدا اور آخرت کو نظر انداز کر دینے کے بعد اخلاق کے لیے اگر کوئی قابلِ عمل نظام بن سکتا ہے تو وہ صرف افادیت (utilitarianism) کی بنیادوں پر بن سکتا ہے۔ باقی تمام اخلاقی فلسفے محض فرضی اور کتابی ہیں نہ کہ عملی۔ اور افادیت جو اخلاق پیدا کرتی ہے اسے خواہ کتنی ہی وسعت دی جائے، بہرحال وہ اس سے آگے نہیں جاتا کہ آدمی وہ کام کرے جس کا کوئی فائدہ اِس دنیا میں اُس کی ذات کی طرف، یا اُس معاشرے کی طرف جس سے وہ تعلّق رکھتا ہے، پلٹ کر آنے کی توقع ہو۔ یہ وہ چیز ہے جو فائدے کی اُمید اور نقصان کے اندیشے کی بنا پر انسان سے سچ اور جھوٹ، امانت اور خیانت، ایمان داری اور بے ایمانی، وفا اور غدر، انصاف اور ظلم، غرض ہر نیکی اور اس کی ضد کا حسبِ موقع ارتکاب کرا سکتی ہے۔ اِن اخلاقیات کا بہترین نمونہ موجودہ زمانے کی انگریز قوم ہے، جس کو اکثر اس امر کی مثال میں پیش کیا جاتا ہے کہ مادّہ پرستانہ نظریۂ حیات رکھنے اور آخرت کے تصوّر سے خالی ہونے کے باوجود اس قوم کے افراد بالعُموم دوسروں سے زیادہ سچے، کھرے، دیانت دار، عہد کے پابند، انصاف پسند اور معاملات میں قابلِ اعتماد ہیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ افادی اخلاقیات کی ناپائداری کا سب سے زیادہ نمایاں عملی ثبوت ہم کو اسی قوم کے کردار میں ملتا ہے۔ اگر فی الواقع انگریزوں کی سچّائی، انصاف پسندی، راست بازی اور عہد کی پابندی اس یقین و اذعان پر مبنی ہوتی کہ یہ صفات بجائے خود مستقل اخلاقی خوبیاں ہیں، تو آخر یہ کس طرح ممکن تھا کہ ایک ایک انگریز تو اپنے شخصی کردار میں ان کا حامل ہوتا مگر ساری قوم مل کر جن لوگوں کو اپنا نمایندہ اور اپنے اجتماعی اُمور کا سربراہِ کار بناتی ہے، وہ بڑے پیمانے پر اس کی سلطنت اور اس کے بین الاقوامی معاملات کے چلانے میں عَلانیَہ جھوٹ، بدعہدی، ظلم، بے انصافی اور بددیانتی سے کام لیتے اور پوری قوم کا اعتماد ان کو حاصل رہتا؟ کیا یہ اس بات کا صریح ثبوت نہیں ہے کہ یہ لوگ مستقل اخلاقی قدروں کے قائل نہیں ہیں، بلکہ دنیوی فائدے اور نقصان کے لحاظ سے بیک وقت دو متضاد اخلاقی رَوِیّے اختیار کرتے ہیں اور کر سکتے ہیں؟

تاہم اگر کوئی منکرِ خدا و آخرت فی الواقع دنیا میں ایسا موجود ہے جو مستقل طور پر بعض نیکیوں کا پابند اور بعض بدیوں سے مجتنب ہے تو درحقیقت اس کی یہ نیکی اور پرہیزگاری اس کے مادّہ پرستانہ نظریّۂ حیات کا نتیجہ نہیں ہے بلکہ اُن مذہبی اثرات کا نتیجہ ہے جو غیر شُعوری طور پر اس کے نفس میں متمکّن ہیں۔ اس کا اخلاقی سرمایہ مذہب سے چُرایا ہُوا ہے اور اس کو وہ ناروا طریقے سے لامذہبی میں استعمال کر رہا ہے۔ کیونکہ وہ اپنی لامذہبی و مادّہ پرستی کے خزانے میں اِس سرمایے کے ماخذ کی نشان دِہی ہرگز نہیں کر سکتا۔

عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ يَهْدِيْهِمْ رَبُّهُمْ بِاِيْمَانِهِمْ ۚ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهِمُ الْاَنْهٰرُ فِيْ جَنّٰتِ النَّعِيْمِ ۝ ۹ دَعْوٰىهُمْ فِيْهَا سُبْحٰنَكَ اللّٰهُمَّ وَ تَحِيَّتُهُمْ فِيْهَا سَلٰمٌ ۚ وَ اٰخِرُ دَعْوٰىهُمْ اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ

کتاب میں پیش کی گئی ہیں) اور نیک اعمال کرتے رہے، انھیں اُن کا رب اُن کے ایمان کی وجہ سے سیدھی راہ چلائے گا، نعمت بھری جنتوں میں ان کے نیچے نہریں بہیں گی،[۱۳] وہاں ان کی صدا یہ ہوگی کہ ”پاک ہے تو اے خدا“، اُن کی دُعا یہ ہوگی کہ ”سلامتی ہو“ اور ان کی ہر بات کا خاتمہ اس پر ہو گا کہ ”ساری تعریف اللہ

---

۱۳ – اِس جملے پر سے سرسری طور پر نہ گزر جائیے۔ اس کے مضمون کی ترتیب گہری توجہ کی مستحق ہے:

ان لوگوں کو آخرت کی زندگی میں جنّت کیوں ملے گی؟ ــــ اس لیے کہ وہ دُنیا کی زندگی میں سیدھی راہ چلے۔ ہر کام میں، ہر شعبۂ زندگی میں، ہر انفرادی و اجتماعی معاملے میں انھوں نے برحق طریقہ اختیار کیا اور باطل طریقوں کو چھوڑ دیا۔

یہ ہر ہر قدم پر، زندگی کے ہر موڑ اور ہر دوراہے پر، اُن کو صحیح اور غلط، حق اور باطل، راست اور ناراست کی تمیز کیسے حاصل ہوئی؟ اور پھر اس تمیز کے مطابق راست روی پر ثبات اور کج رَوی سے پرہیز کی طاقت انھیں کہاں سے ملی؟ ان کے رب کی طرف سے، کیونکہ وہی علمی رہنمائی اور عملی توفیق کا منبع ہے۔

ان کا رب انھیں یہ ہدایت اور یہ توفیق کیوں دیتا رہا؟ ــــ ان کے ایمان کی وجہ سے۔

یہ نتائج جو اُوپر بیان ہوئے ہیں، کس ایمان کے نتائج ہیں؟ ــــ اُس ایمان کے نہیں جو محض مان لینے کے معنیٰ میں ہو، بلکہ اُس ایمان کے جو سیرت و کردار کی روح بن جائے اور جس کی طاقت سے اخلاق و اعمال میں صَلاح کا ظہور ہونے لگے۔ اپنی جسمانی زندگی میں آپ خود دیکھتے ہیں کہ بقائے حیات، تندرستی، قوتِ کار اور لذتِ زندگانی کا حُصول صحیح قسم کی غذا پر موقوف ہوتا ہے، لیکن یہ نتائج اُس تغذِیے کے نہیں ہوتے جو محض کھا لینے کے معنیٰ میں ہو، بلکہ اُس تغذیے کے ہوتے ہیں جو ہضم ہو کر خون بنے اور رگ رگ میں پہنچ کر ہر حصۂ جسم کو وہ طاقت بخشے جس سے وہ اپنے حصّے کا کام ٹھیک کرنے لگے۔ بالکل اسی طرح اخلاقی زندگی میں بھی ہدایت یابی، راست بینی، راست رَوی اور بالآخر فلاح و کامیابی کا حصول صحیح عقائد پر موقوف ہے، مگر یہ نتائج اُن عقائد کے نہیں ہیں جو محض زبان پر جاری ہوں یا دل و دماغ کے کسی گوشے میں بے کار پڑے ہوئے ہوں، بلکہ ان عقائد کے ہیں جو نفس کے اندر جذب و پیوست ہو کر اندازِ فکر اور مذاقِ طبع اور اُفتادِ مزاج بن جائیں، اور سیرت و کردار اور رَوِیّۂ زندگی کی صورت میں نمایاں ہوں۔ خدا کے قانونِ طبیعی میں وہ شخص جو کھا کر نہ کھانے والے کی طرح رہے، اُن انعامات کا مستحق نہیں ہوتا جو کھا کر ہضم کرنے والے کے لیے رکھے گئے ہیں۔ پھر کیوں توقع کی جائے کہ اُس کے قانونِ اخلاقی میں وہ شخص جو مان کر نہ ماننے والے کی طرح رہے، اُن انعامات

رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ۝۱۰ وَلَوْ یُعَجِّلُ اللّٰهُ لِلنَّاسِ الشَّرَّ اسْتِعْجَالَهُمْ

ع ۱۰

رب العالمین ہی کے لیے ہے۔[14]‘‘ ع

اگر کہیں[15] اللہ لوگوں کے ساتھ بُرا معاملہ کرنے میں بھی اتنی ہی جلدی کرتا جتنی وہ دُنیا کی بھلائی

کا مستحق ہوسکتا ہے جو مان کر صالح بننے والے کے لیے رکھے گئے ہیں؟

۱۴- یہاں ایک لطیف انداز میں یہ بتایا گیا ہے کہ دنیا کے دار الامتحان سے کامیاب ہو کر نکلنے اور نعمت بھری جنتوں میں پہنچ جانے کے بعد یہ نہیں ہوگا کہ یہ لوگ بس وہاں پہنچتے ہی سامانِ عیش پر بھوکوں کی طرح ٹوٹ پڑیں گے اور ہر طرف سے لاؤ حوریں، لاؤ شراب اور بجے چنگ و رُباب کی صدائیں بلند ہونے لگیں گی، جیسا کہ جنت کا نام سنتے ہی بعض کج فہم حضرات کے ذہن میں اس کا نقشہ گھومنے لگتا ہے۔ بلکہ درحقیقت صالح اہلِ ایمان دُنیا میں افکارِ عالیہ اور اخلاقِ فاضلہ اختیار کر کے، اپنے جذبات کو سنوار کر، اپنی خواہشات کو سُدھار کر، اور اپنی سیرت و کردار کو پاکیزہ بنا کر، جس قسم کی بلند ترین شخصیتیں اپنی ذات میں بہم پہنچائیں گے، وہی دُنیا کے ماحول سے مختلف، جنت کے پاکیزہ ترین ماحول میں اَور زیادہ نکھر کر اُبھر آئیں گی اور اُن کے وہی اوصاف، جو دنیا میں انھوں نے پرورش کیے تھے، وہاں اپنی پوری شان کے ساتھ ان کی سیرت میں جلوہ گر ہوں گے۔ ان کا محبُوب ترین مشغلہ وہی اللہ کی حمد و تقدیس ہوگا جس سے دُنیا میں وہ مانوس تھے، اور ان کی سوسائٹی میں وہی ایک دوسرے کی سلامتی چاہنے کا جذبہ کارفرما ہوگا جسے دُنیا میں انھوں نے اپنے اجتماعی رَوِیّے کی روح بنایا تھا۔

۱۵- اُوپر کے تمہیدی فقروں کے بعد اب نصیحت اور تفہیم کی تقریر شروع ہوتی ہے۔ اس تقریر کو پڑھنے سے پہلے اس کے پَس منظر سے متعلق دو باتیں پیشِ نظر رکھنی چاہییں:

ایک یہ کہ اِس تقریر سے تھوڑی مدّت پہلے وہ مسلسل اور سخت بلا انگیز قحط ختم ہُوا تھا جس کی مصیبت سے اہلِ مکہ چیخ اُٹھے تھے۔ اس قحط کے زمانے میں قریش کے متکبرین کی اکڑی ہوئی گردنیں بہت جھک گئی تھیں۔ دعائیں اور زاریاں کرتے تھے، بُت پرستی میں کمی آ گئی تھی، خدائے واحد کی طرف رُجوع بڑھ گیا تھا اور نوبت یہ آ گئی تھی کہ آخرِ کار ابوسفیان نے آ کر نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے درخواست کی کہ آپ خدا سے اس بلا کو ٹالنے کے لیے دُعا کریں۔ مگر جب قحط دُور ہوگیا، بارشیں ہونے لگیں اور خوش حالی کا دَور آیا تو ان لوگوں کی وہی سرکشیاں اور بد اعمالیاں، اور دینِ حق کے خلاف وہی سرگرمیاں پھر شروع ہوگئیں اور جو دل خدا کی طرف رُجوع کرنے لگے تھے وہ پھر اپنی سابق غفلتوں میں ڈوب گئے۔ (مُلاحظہ ہو: النحل، آیت ۱۱۳۔ المؤمنون، آیات ۷۵ تا ۷۷۔ الدُّخان، آیات ۱۰ تا ۱۶)

دوسرے یہ کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم جب کبھی ان لوگوں کو انکارِ حق کی پاداش سے ڈراتے تھے تو یہ لوگ جواب میں کہتے تھے کہ تم جس عذابِ الٰہی کی دھمکیاں دیتے ہو وہ آخر آ کیوں نہیں جاتا۔ اس کے آنے میں دیر کیوں لگ رہی ہے۔

اسی پر فرمایا جا رہا ہے کہ خدا لوگوں پر رحم و کرم فرمانے میں جتنی جلدی کرتا ہے، ان کو سزا دینے اور ان کے گناہوں پر پکڑ لینے میں اتنی جلدی نہیں کرتا۔ تم چاہتے ہو کہ جس طرح اس نے تمھاری دعائیں سُن کر بلائے قحط جلدی سے دُور کر دی، اُسی طرح وہ تمھارے

بِالْخَيْرِ لَقُضِيَ إِلَيْهِمْ أَجَلُهُمْ ۖ فَنَذَرُ الَّذِينَ لَا يَرْجُونَ لِقَاءَنَا فِي طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُونَ ﴿١١﴾ وَإِذَا مَسَّ الْإِنسَانَ الضُّرُّ دَعَانَا لِجَنبِهِ أَوْ قَاعِدًا أَوْ قَائِمًا فَلَمَّا كَشَفْنَا عَنْهُ ضُرَّهُ مَرَّ كَأَن لَّمْ يَدْعُنَا إِلَىٰ ضُرٍّ مَّسَّهُ ۚ كَذَٰلِكَ زُيِّنَ لِلْمُسْرِفِينَ مَا كَانُوا يَعْمَلُونَ ﴿١٢﴾ وَلَقَدْ أَهْلَكْنَا الْقُرُونَ مِن قَبْلِكُمْ

مانگنے میں جلدی کرتے ہیں تو ان کی مُہلتِ عمل کبھی کی ختم کر دی گئی ہوتی۔ (مگر ہمارا یہ طریقہ نہیں ہے) اس لیے ہم اُن لوگوں کو جو ہم سے ملنے کی توقع نہیں رکھتے، اُن کی سرکشی میں بھٹکنے کے لیے چھُوٹ دے دیتے ہیں۔ انسان کا حال یہ ہے کہ جب اس پر کوئی سخت وقت آتا ہے تو کھڑے اور بیٹھے اور لیٹے ہم کو پکارتا ہے، مگر جب ہم اس کی مصیبت ٹال دیتے ہیں تو ایسا چل نکلتا ہے کہ گویا اس نے کبھی اپنے کسی بُرے وقت پر ہم کو پکارا ہی نہ تھا۔ اس طرح حد سے گزر جانے والوں کے لیے ان کے کرتوت خوش نما بنا دیے گئے ہیں۔ لوگو! تم سے پہلے کی قوموں[16] کو (جو اپنے اپنے زمانے میں برسرِ عُروج تھیں) ہم نے ہلاک کر دیا

چیلنج سُن کر اور تمھاری سرکشیاں دیکھ کر عذاب بھی فوراً بھیج دے۔ لیکن خدا کا طریقہ یہ نہیں ہے۔ لوگ خواہ کتنی ہی سرکشیاں کیے جائیں، وہ ان کو پکڑنے سے پہلے سنبھلنے کا کافی موقع دیتا ہے۔ پیہم تنبیہات بھیجتا ہے اور رسّی ڈھیلی چھوڑے رکھتا ہے۔ یہاں تک کہ جب رعایت کی حد ہو جاتی ہے تب پاداشِ عمل کا قانون نافذ کیا جاتا ہے۔ یہ تو ہے خدا کا طریقہ۔ اور اس کے برعکس کم ظرف انسانوں کا طریقہ وہ ہے جو تم نے اختیار کیا کہ جب مصیبت آئی تو خدا یاد آنے لگا، بلبلانا اور گڑگڑانا شروع کر دیا، اور جہاں راحت کا دَور آیا کہ سب کچھ بھول گئے۔ یہی وہ لچھن ہیں جن سے قومیں اپنے آپ کو عذابِ الٰہی کا مستحق بناتی ہیں۔

۱۶ – اصل میں لفظ "قَرن" استعمال ہُوا ہے جس سے مراد عام طور پر تو عَرَبی زبان میں ایک "عہد کے لوگ" ہوتے ہیں، لیکن قرآنِ مجید میں جس انداز سے مختلف مواقع پر اس لفظ کو استعمال کیا گیا ہے اس سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ "قرن" سے مراد وہ قوم ہے جو اپنے دَور میں برسرِ عُروج اور کُلّی یا جُزئی طور پر امامتِ عالَم پر سرفراز رہی ہو۔ ایسی قوم کی ہلاکت لازماً یہی معنی نہیں رکھتی کہ اس کی نسل کو بالکل غارت ہی کر دیا جائے، بلکہ اس کا مقامِ عروج و امامت سے گرا دیا جانا، اس کی تہذیب و تمدّن کا تباہ ہو جانا، اس کے تشخّص کا مٹ جانا اور اس کے اجزا کا پارہ پارہ ہو کر دوسری قوموں میں گم ہو جانا، یہ بھی ہلاکت ہی کی ایک صورت ہے۔

لَمَّا ظَلَمُوۡا ۙ وَجَآءَتۡهُمۡ رُسُلُهُمۡ بِالۡبَيِّنٰتِ وَمَا كَانُوۡا لِيُؤۡمِنُوۡا ؕ كَذٰلِكَ نَجۡزِى الۡقَوۡمَ الۡمُجۡرِمِيۡنَ ﴿۱۳﴾ ثُمَّ جَعَلۡنٰكُمۡ خَلٰٓـئِفَ فِى الۡاَرۡضِ مِنۡۢ بَعۡدِهِمۡ لِنَـنۡظُرَ كَيۡفَ تَعۡمَلُوۡنَ ﴿۱۴﴾ وَاِذَا تُتۡلٰى عَلَيۡهِمۡ اٰيَاتُنَا بَيِّنٰتٍ ۙ قَالَ الَّذِيۡنَ لَا يَرۡجُوۡنَ لِقَآءَنَا ائۡتِ بِقُرۡاٰنٍ غَيۡرِ هٰذَاۤ اَوۡ بَدِّلۡهُ ؕ قُلۡ مَا يَكُوۡنُ لِىۡۤ اَنۡ اُبَدِّلَهٗ مِنۡ تِلۡقَآئِ نَفۡسِىۡ ۚ اِنۡ اَتَّبِعُ

جب انھوں نے ظلم کی روش[17] اختیار کی اور اُن کے رسُول اُن کے پاس کُھلی کُھلی نشانیاں لے کر آئے اور انھوں نے ایمان لاکر ہی نہ دیا۔ اس طرح ہم مجرموں کو ان کے جرائم کا بدلہ دیا کرتے ہیں۔ اب ان کے بعد ہم نے تم کو زمین میں ان کی جگہ دی ہے، تاکہ دیکھیں تم کیسے عمل کرتے ہو۔[18]

جب انھیں ہماری صاف صاف باتیں سُنائی جاتی ہیں تو وہ لوگ جو ہم سے ملنے کی توقع نہیں رکھتے، کہتے ہیں کہ "اِس کے بجائے کوئی اور قرآن لاؤ یا اس میں کچھ ترمیم کرو"۔[19] اے محمدؐ! ان سے کہو: "میرا یہ کام نہیں ہے کہ اپنی طرف سے اس میں کوئی تغیّر وتبدّل کرلوں۔ میں تو بس اُس وحی کا پیرو ہوں جو میرے پاس

۱۷- یہ لفظِ ظلم اُن محدود معنوں میں نہیں ہے جو عام طور پر اس سے مراد لیے جاتے ہیں، بلکہ یہ ان تمام گناہوں پر حاوی ہے جو انسان بندگی کی حد سے گزر کر کرتا ہے۔ (تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: سورۂ بقرہ، حاشیہ ۴۹)

۱۸- خیال رہے کہ خطاب اہلِ عرب سے ہو رہا ہے، اور ان سے کہا یہ جارہا ہے کہ پچھلی قوموں کو اپنے اپنے زمانے میں کام کرنے کا موقع دیا گیا تھا، مگر انھوں نے آخرکار ظلم وبغاوت کی رَوِش اختیار کی اور جو انبیاؑ ان کو راہِ راست دکھانے کے لیے بھیجے گئے تھے ان کی بات انھوں نے نہ مانی، اس لیے وہ ہمارے امتحان میں ناکام ہوئیں اور میدان سے ہٹا دی گئیں۔ اب اے اہلِ عرب! تمھاری باری آئی ہے۔ تمھیں ان کی جگہ کام کرنے کا موقع دیا جاتا ہے۔ تم اس امتحان گاہ میں کھڑے ہو جس سے تمھارے پیش رَو ناکام ہو کر نکالے جاچکے ہیں۔ اگر تم نہیں چاہتے کہ تمھارا انجام بھی وہی ہو جو ان کا ہُوا تو اس موقع سے، جو تمھیں دیا جارہا ہے، صحیح فائدہ اٹھاؤ، پچھلی قوموں کی تاریخ سے سبق لو اور اُن غلطیوں کا اعادہ نہ کرو جو اُن کی تباہی کی موجب ہوئیں۔

۱۹- اُن کا یہ قول اوّل تو اس مفروضے پر مبنی تھا کہ محمدؐ جو کچھ پیش کر رہے ہیں یہ خدا کی طرف سے نہیں ہے بلکہ ان کے اپنے دماغ کی تصنیف ہے، اور اس کو خدا کی طرف منسوب کرکے انھوں نے صرف اس لیے پیش کیا ہے کہ ان کی بات کا وزن بڑھ

اِلَّا مَا يُوْحٰٓى اِلَيَّ ۚ اِنِّيْٓ اَخَافُ اِنْ عَصَيْتُ رَبِّيْ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيْمٍ ﴿۱۵﴾ قُلْ لَّوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا تَلَوْتُهٗ عَلَيْكُمْ وَلَآ اَدْرٰىكُمْ بِهٖ ۖ فَقَدْ لَبِثْتُ فِيْكُمْ عُمُرًا مِّنْ قَبْلِهٖ ۭ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ﴿۱۶﴾ فَمَنْ

بھیجی جاتی ہے۔ اگر میں اپنے رب کی نافرمانی کروں تو مجھے ایک بڑے ہولناک دن کے عذاب کا ڈر ہے۔[20]" اور کہو: "اگر اللہ کی مشیّت یہی ہوتی تو میں یہ قرآن تمھیں کبھی نہ سُناتا اور اللہ تمھیں اس کی خبر تک نہ دیتا۔ آخر اس سے پہلے میں ایک عمر تمھارے درمیان گزار چکا ہوں، کیا تم عقل سے کام نہیں لیتے؟[21] پھر اُس سے

جائے۔ دوسرے ان کا مطلب یہ تھا کہ یہ تم نے توحید اور آخرت اور اخلاقی پابندیوں کی بحث کیا چھیڑ دی، اگر رہنمائی کے لیے اُٹھے ہو تو کوئی ایسی چیز پیش کرو جس سے قوم کا بھلا ہو اور اس کی دُنیا بنتی نظر آئے۔ تاہم اگر تم اپنی اس دعوت کو بالکل نہیں بدلنا چاہتے تو کم از کم اس میں اتنی لچک ہی پیدا کرو کہ ہمارے اور تمھارے درمیان کم و بیش پر مُصالحت ہو سکے۔ کچھ ہم تمھاری مانیں، کچھ تم ہماری مان لو۔ تمھاری توحید میں کچھ ہمارے شرک کے لیے، تمھاری خدا پرستی میں کچھ ہماری نفس پرستی اور دنیا پرستی کے لیے اور تمھارے عقیدۂ آخرت میں کچھ ہماری ان امیدوں کے لیے بھی گنجایش نکلنی چاہیے کہ دنیا میں ہم جو چاہیں کرتے رہیں، آخرت میں ہماری کسی نہ کسی طرح نجات ضرور ہو جائے گی۔ پھر تمھارے یہ قطعی اور حتمی اخلاقی اُصول بھی ہمارے لیے ناقابلِ قبول ہیں۔ ان میں کچھ ہمارے تعصُّبات کے لیے، کچھ ہمارے رسم و رواج کے لیے، کچھ ہماری شخصی اور قومی اغراض کے لیے، اور کچھ ہماری خواہشاتِ نفس کے لیے بھی جگہ نکلنی چاہیے۔ کیوں نہ ایسا ہو کہ دین کے مطالبات کا ایک مناسب دائرہ ہماری اور تمھاری رضامندی سے طے ہو جائے اور اس میں ہم خدا کا حق ادا کر دیا کریں۔ اس کے بعد ہمیں آزاد چھوڑ دیا جائے کہ جس جس طرح اپنی دنیا کے کام چلانا چاہتے ہیں چلائیں۔ مگر تم یہ غضب کر رہے ہو کہ پوری زندگی کو اور سارے معاملات کو توحید و آخرت کے عقیدے اور شریعت کے ضابطے سے کس دینا چاہتے ہو۔

۲۰ – یہ اُوپر کی دونوں باتوں کا جواب ہے۔ اس میں یہ بھی کہہ دیا گیا کہ میں اس کتاب کا مصنف نہیں ہوں بلکہ یہ وحی کے ذریعے سے میرے پاس آئی ہے جس میں کسی ردّ و بدل کا مجھے اختیار نہیں۔ اور یہ بھی کہ اس معاملے میں مُصالحت کا قطعاً کوئی امکان نہیں ہے، قبول کرنا ہو تو اس پورے دین کو جوں کا توں قبول کرو ورنہ پورے کو ردّ کر دو۔

۲۱ – یہ ایک زبردست دلیل ہے اُن کے اِس خیال کی تردید میں کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم قرآن کو خود اپنے دل سے گھڑ کر خدا کی طرف منسوب کر رہے ہیں، اور محمدؐ کے اس دعوے کی تائید میں کہ وہ خود اس کے مصنف نہیں ہیں بلکہ یہ خدا کی طرف سے بذریعۂ وحی ان پر نازل ہو رہا ہے۔ دوسرے تمام دلائل تو پھر نسبتاً دُور کی چیز تھے، مگر محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی تو اُن لوگوں کے سامنے کی چیز تھی۔ آپؐ نے نبوت سے پہلے پورے چالیس سال ان کے درمیان گزارے تھے۔ ان کے شہر میں پیدا ہوئے، ان کی آنکھوں کے

سامنے بچپن گزارا، جوان ہوئے، ادھیڑ عمر کو پہنچے۔ رہنا سہنا، مِلنا جُلنا، لین دین، شادی بیاہ، غرض ہر قسم کا معاشرتی تعلق انھی کے ساتھ تھا اور آپؐ کی زندگی کا کوئی پہلو اُن سے چھپا ہُوا نہ تھا۔ ایسی جانی بُوجھی اور دیکھی بھالی چیز سے زیادہ کھلی شہادت اور کیا ہو سکتی تھی۔

آپؐ کی اس زندگی میں دو باتیں بالکل عیاں تھیں جنھیں مکّہ کے لوگوں میں سے ایک ایک شخص جانتا تھا:

ایک یہ کہ نبوت سے پہلے کی پوری چالیس سالہ زندگی میں آپؐ نے کوئی ایسی تعلیم، تربیت اور صحبت نہیں پائی جس سے آپؐ کو وہ معلومات حاصل ہوتیں جن کے چشمے یکایک دعوائے نبوت کے ساتھ ہی آپؐ کی زبان سے پھوٹنے شروع ہو گئے۔ اس سے پہلے کبھی آپؐ اُن مسائل سے دلچسپی لیتے ہوئے، اُن مَباحِث پر گفتگو کرتے ہوئے، اور اُن خیالات کا اظہار کرتے ہوئے نہیں دیکھے گئے جواب قرآن کی اِن پے در پے سورتوں میں زیرِ بحث آئے تھے۔ حد یہ ہے کہ اس پورے چالیس سال کے دوران میں کبھی آپؐ کے کسی گہرے دوست اور کسی قریب ترین رشتہ دار نے بھی آپؐ کی باتوں اور آپؐ کی حرکات وسکنات میں کوئی ایسی چیز محسوس نہیں کی جسے اُس عظیم الشان دعوت کی تمہید کہا جا سکتا ہو جو آپؐ نے اچانک چالیسویں سال کو پہنچ کر دینی شروع کر دی۔ یہ اس بات کا صریح ثبوت تھا کہ قرآن آپؐ کے اپنے دماغ کی پیداوار نہیں ہے، بلکہ خارج سے آپؐ کے اندر آئی ہوئی چیز ہے۔ اس لیے کہ انسانی دماغ اپنی عمر کے کسی مرحلے میں بھی ایسی کوئی چیز پیش نہیں کر سکتا جس کے نَشو وَنَما اور ارتقا کے واضح نشانات اُس سے پہلے کے مرحلوں میں نہ پائے جاتے ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ مکہ کے بعض چالاک لوگوں نے جب خود محسوس کر لیا کہ قرآن کو آپؐ کے دماغ کی پیداوار قرار دینا صریح طور پر ایک لغو الزام ہے تو آخر کو انھوں نے یہ کہنا شروع کر دیا کہ کوئی اور شخص ہے جو محمدؐ کو یہ باتیں سکھا دیتا ہے۔ لیکن یہ دوسری بات پہلی بات سے بھی زیادہ لغو تھی۔ کیونکہ مکہ تو درکنار، پورے عرب میں کوئی اس قابلیت کا آدمی نہ تھا جس پر اُنگلی رکھ کر کہہ دیا جاتا کہ یہ اس کلام کا مصنف ہے یا ہو سکتا ہے۔ ایسی قابلیت کا آدمی کسی سوسائٹی میں چھپا کیسے رہ سکتا ہے؟

دوسری بات جو آپؐ کی سابق زندگی میں بالکل نمایاں تھی، وہ یہ تھی کہ جھوٹ، فریب، جَعْل، مکّاری، عیّاری اور اس قبیل کے دوسرے اوصاف میں سے کسی کا ادنیٰ شائبہ تک آپؐ کی سیرت میں نہ پایا جاتا تھا۔ پوری سوسائٹی میں کوئی ایسا نہ تھا جو یہ کہہ سکتا ہو کہ اس چالیس سال کی یک جائی معاشرت میں آپؐ سے کسی ایسی صفت کا تجرِبہ اسے ہُوا ہے۔ برعکس اس کے جن جن لوگوں کو بھی آپؐ سے سابقہ پیش آیا تھا، وہ آپؐ کو ایک نہایت سچّے، بے داغ، اور قابلِ اعتماد (امین) انسان کی حیثیت ہی سے جانتے تھے۔ نبوت سے پانچ ہی سال پہلے تعمیرِ کعبہ کے سلسلے میں وہ مشہور واقعہ پیش آ چکا تھا جس میں حَجَرِ اَسْوَد کو نصب کرنے کے معاملے پر قریش کے مختلف خاندان جھگڑ پڑے تھے اور آپس میں طے ہُوا تھا کہ کل صبح پہلا شخص جو حرم میں داخل ہوگا اسی کو پنچ مان لیا جائے گا۔ دوسرے روز وہ شخص محمد صلی اللہ علیہ وسلم تھے جو وہاں داخل ہوئے۔ آپؐ کو دیکھتے ہی سب لوگ پکار اُٹھے: ھٰذا الامین، رضینا، ھٰذا محمد۔ ”یہ بالکل راست باز آدمی ہے۔ ہم اس پر راضی ہیں۔ یہ تو محمدؐ ہے۔“ اس طرح آپؐ کو نبی مقرر کرنے سے پہلے اللہ تعالیٰ پورے قبیلۂ قریش سے بھرے مجمع میں آپؐ کے ”امین“ ہونے کی شہادت لے چکا تھا۔ اب یہ گمان کرنے کی کیا گنجایش تھی کہ جس شخص نے تمام عمر کبھی اپنی زندگی کے کسی چھوٹے سے چھوٹے معاملے میں بھی جھوٹ، جَعْل اور فریب سے کام نہ لیا تھا، وہ یکایک اتنا بڑا جھوٹ اور ایسا عظیم الشان جَعْل وفریب لے کر اُٹھ کھڑا ہُوا کہ اپنے ذہن سے کچھ باتیں تصنیف کیں اور ان کو پورے زور اور تحدّی کے ساتھ خدا کی طرف منسوب

أَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرَىٰ عَلَى اللَّهِ كَذِبًا أَوْ كَذَّبَ بِآيَاتِهِ ۚ إِنَّهُ لَا يُفْلِحُ الْمُجْرِمُونَ ﴿١٧﴾

بڑھ کر ظالم اور کون ہو گا جو ایک جھوٹی بات گھڑ کر اللہ کی طرف منسوب کرے یا اللہ کی واقعی آیات کو جھوٹا قرار دے[۲۲]۔ یقیناً مجرم کبھی فلاح نہیں پا سکتے[۲۳]۔''

کرنے لگا۔

اسی بنا پر اللہ تعالیٰ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے فرماتا ہے کہ ان کے اس بیہودہ الزام کے جواب میں ان سے کہو کہ اللہ کے بندو! کچھ عقل سے تو کام لو، میں کوئی باہر سے آیا ہُوا اجنبی آدمی نہیں ہوں، تمہارے درمیان اس سے پہلے ایک عمر گزار چکا ہوں، میری سابق زندگی کو دیکھتے ہوئے تم کیسے یہ توقع مجھ سے کر سکتے ہو کہ میں خدا کی تعلیم اور اس کے حکم کے بغیر یہ قرآن تمہارے سامنے پیش کر سکتا تھا۔ (مزید تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: سورۂ قصص، حاشیہ ۱۰۹)

۲۲ – یعنی اگر یہ آیات خدا کی نہیں ہیں اور میں انھیں خود تصنیف کر کے آیاتِ الٰہی کی حیثیت سے پیش کر رہا ہوں تو مجھ سے بڑا ظالم کوئی نہیں۔ اور اگر یہ واقعی اللہ کی آیات ہیں اور تم ان کو جھٹلا رہے ہو تو پھر تم سے بڑا بھی کوئی ظالم نہیں۔

۲۳ – بعض نادان لوگ ''فلاح'' کو طویل عمر، یا دنیوی خوش حالی، یا دنیوی فروغ کے معنیٰ میں لے لیتے ہیں، اور پھر اس آیت سے یہ نتیجہ نکالنا چاہتے ہیں کہ جو شخص نبوت کا دعویٰ کر کے جیتا رہے، یا دُنیا میں پھلے پھُولے، یا اس کی دعوت کو فروغ نصیب ہو، اُسے نبیِ برحق مان لینا چاہیے، کیونکہ اس نے فلاح پائی۔ اگر وہ نبیِّ برحق نہ ہوتا تو جھوٹا دعویٰ کرتے ہی مار ڈالا جاتا، یا بھوکوں مار دیا جاتا اور دُنیا میں اس کی بات چلنے ہی نہ پاتی۔ لیکن یہ احمقانہ اِستدلال صرف وہی شخص کر سکتا ہے جو نہ تو قرآنی اصطلاحِ ''فلاح'' کا مفہوم جانتا ہو، نہ اُس قانونِ اِمہال سے واقف ہو جو قرآن کے بیان کے مطابق اللہ تعالیٰ نے مجرموں کے لیے مقرر فرمایا ہے، اور نہ یہی سمجھتا ہو کہ اس سلسلۂ بیان میں یہ فقرہ کس معنیٰ میں آیا ہے۔

اوّل تو یہ بات کہ ''مجرم فلاح نہیں پا سکتے'' اس سیاق میں اس حیثیت سے فرمائی ہی نہیں گئی ہے کہ یہ کسی کے دعوائے نبوت کو پرکھنے کا معیار ہے، جس سے عام لوگ جانچ کر خود فیصلہ کر لیں کہ جو مدّعیِ نبوّت ''فلاح'' پا رہا ہو اس کے دعوے کو مانیں اور جو فلاح نہ پا رہا ہو اس کا انکار کر دیں۔ بلکہ یہاں تو یہ بات اس معنیٰ میں کہی گئی ہے کہ ''میں یقین کے ساتھ جانتا ہوں کہ مجرموں کو فلاح نصیب نہیں ہو سکتی، اس لیے میں خود تو یہ جرم نہیں کر سکتا کہ نبوت کا جھوٹا دعویٰ کروں، البتہ تمہارے متعلق مجھے یقین ہے کہ تم سچے نبی کو جھٹلانے کا جرم کر رہے ہو، اس لیے تمھیں فلاح نصیب نہیں ہو گی۔''

پھر فلاح کا لفظ بھی قرآن میں دنیوی فلاح کے محدود معنیٰ میں نہیں آیا ہے، بلکہ اس سے مراد وہ پائدار کامیابی ہے جو کسی خُسران پر منتج ہونے والی نہ ہو، قطعِ نظر اس سے کہ دنیوی زندگی کے اِس ابتدائی مرحلے میں اس کے اندر کامیابی کا کوئی پہلو ہو یا نہ ہو۔ ہو سکتا ہے کہ ایک داعیِ ضلالت دُنیا میں مزے سے جیے، خوب پھلے پھولے اور اس کی گمراہی کو بڑا فروغ نصیب ہو، مگر یہ قرآن کی اصطلاح میں فلاح نہیں، عین خُسران ہے۔ اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ایک داعیِ حق دُنیا میں سخت مصیبتوں سے دوچار ہو، شدّتِ آلام سے نڈھال

وَيَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَضُرُّهُمْ وَلَا يَنْفَعُهُمْ وَيَقُوْلُوْنَ

یہ لوگ اللہ کے سوا اُن کی پرستش کر رہے ہیں جو ان کو نہ نقصان پہنچا سکتے ہیں نہ نفع، اور کہتے یہ ہیں کہ

ہو کر یا ظالموں کی دست درازیوں کا شکار ہو کر دُنیا سے جلدی رخصت ہو جائے، اور کوئی اسے مان کر نہ دے، مگر یہ قرآن کی زبان میں خُسران نہیں، عین فلاح ہے۔

علاوہ بریں قرآن میں جگہ جگہ یہ بات پوری تشریح کے ساتھ بیان کی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ مجرموں کو پکڑنے میں جلدی نہیں کیا کرتا بلکہ انھیں سنبھلنے کے لیے کافی مہلت دیتا ہے، اور اگر وہ اس مہلت سے ناجائز فائدہ اُٹھا کر اور زیادہ بگڑتے ہیں تو اللہ کی طرف سے ان کو ڈھیل دی جاتی ہے اور بسا اوقات ان کو نعمتوں سے نوازا جاتا ہے تاکہ وہ اپنے نفس کی چھُپی ہوئی تمام شرارتوں کو پوری طرح ظہور میں لے آئیں اور اپنے عمل کی بنا پر اُس سزا کے مستحق ہو جائیں جس کے وہ اپنی بری صفات کی وجہ سے فی الحقیقت مستحق ہیں۔ پس اگر کسی جھوٹے مدعی کی رسّی دراز ہو رہی ہو اور اس پر دنیوی ''فلاح'' کی برسات برس رہی ہو تو سخت غلطی ہوگی اگر اس کی اس حالت کو اس کے برسرِ ہدایت ہونے کی دلیل سمجھا جائے۔ خدا کا قانونِ اِمہال و اِستدراج جس طرح تمام مجرموں کے لیے عام ہے اسی طرح جھوٹے مدعیانِ نبوت کے لیے بھی ہے، اور ان کے اس سے مستثنٰی ہونے کی کوئی دلیل نہیں ہے۔ پھر شیطان کو قیامت تک کے لیے جو مہلت اللہ تعالیٰ نے دی ہے اس میں بھی یہ اِستثنا کہیں مذکور نہیں ہے کہ تیرے اَور تو سارے فریب چلنے دیے جائیں گے لیکن اگر تُو اپنی طرف سے کوئی نبی کھڑا کرے گا تو یہ فریب نہ چلنے دیا جائے گا۔

ممکن ہے کوئی شخص ہماری اس بات کے جواب میں وہ آیت پیش کرے جو سورہ اَلحاقّہ، آیات ۴۴-۴۶ میں ارشاد ہوئی ہے کہ وَلَوْ تَقَوَّلَ عَلَيْنَا بَعْضَ الْاَقَاوِيْلِ ۝ لَاَخَذْنَا مِنْهُ بِالْيَمِيْنِ ۝ ثُمَّ لَقَطَعْنَا مِنْهُ الْوَتِيْنَ ۝ ''یعنی اگر محمدؐ نے خود گھڑ کر کوئی بات ہمارے نام سے کہی ہوتی تو ہم اس کا ہاتھ پکڑ لیتے اور اس کی رگِ دل کاٹ ڈالتے۔'' لیکن اس آیت میں جو بات کہی گئی ہے وہ تو یہ ہے کہ جو شخص فی الواقع خدا کی طرف سے نبی مقرر کیا گیا ہو وہ اگر جھوٹی بات گھڑ کر وحی کی حیثیت سے پیش کرے تو فوراً پکڑا جائے۔ اس سے یہ استدلال کرنا کہ جو مدعیِ نبوت پکڑا نہیں جا رہا ہے وہ ضرور سچّا ہے، ایک منطقی مغالطے کے سوا کچھ نہیں ہے۔ خدا کے قانونِ اِمہال و اِستدراج میں جو استثنا اس آیت سے ثابت ہو رہا ہے، وہ صرف سچے نبی کے لیے ہے۔ اس سے یہ نتیجہ نہیں نکلتا کہ جو شخص نبوت کا جھوٹا دعویٰ کرے وہ بھی اس سے مستثنٰی کیا گیا ہے۔ ظاہر بات ہے کہ سرکاری ملازموں کے لیے حکومت نے جو قانون بنایا ہو اس کا اطلاق صرف انھی لوگوں پر ہوگا جو واقعی سرکاری ملازم ہوں۔ رہے وہ لوگ جو جعلی طور پر اپنے آپ کو ایک سرکاری عہدیدار کی حیثیت سے پیش کریں، تو ان پر ضابطۂ ملازمت کا نفاذ نہ ہوگا، بلکہ ان کے ساتھ وہی معاملہ کیا جائے گا جو ضابطۂ فوجداری کے تحت عام بدمعاشوں اور مجرموں کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ علاوہ بریں سورۂ اَلحاقّہ کی اس آیت میں جو کچھ فرمایا گیا ہے وہ بھی اس غرض کے لیے نہیں فرمایا گیا کہ لوگوں کو نبی کے پرکھنے کا یہ معیار بتایا جائے کہ اگر پردۂ غیب سے کوئی ہاتھ نمودار ہو کر اس کی رگِ دل اچانک کاٹ لے تو سمجھیں جھوٹا ہے، ورنہ مان لیں کہ سچّا ہے۔ نبی کے صادق یا کاذب ہونے کی جانچ اگر اس کی سیرت، اس کے کام، اور

هٰٓؤُلَآءِ شُفَعَآؤُنَا عِنْدَ اللّٰهِ ؕ قُلْ اَتُنَبِّـُٔوْنَ اللّٰهَ بِمَا لَا يَعْلَمُ فِي السَّمٰوٰتِ وَلَا فِي الْاَرْضِ ؕ سُبْحٰنَهٗ وَتَعٰلٰى عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ۝۱۸ وَمَا كَانَ النَّاسُ اِلَّاۤ اُمَّةً وَّاحِدَةً فَاخْتَلَفُوْا ؕ وَلَوْلَا كَلِمَةٌ سَبَقَتْ مِنْ رَّبِّكَ لَقُضِيَ بَيْنَهُمْ فِيْمَا فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ ۝۱۹

یہ اللہ کے ہاں ہمارے سِفارشی ہیں۔ اے محمدؐ! ان سے کہو: ”کیا تم اللہ کو اُس بات کی خبر دیتے ہو جسے وہ نہ آسمانوں میں جانتا ہے نہ زمین میں؟[۲۴]“ پاک ہے وہ اور بالا و برتر ہے اُس شرک سے جو یہ لوگ کرتے ہیں۔

ابتداءً سارے انسان ایک ہی اُمّت تھے، بعد میں انھوں نے مختلف عقیدے اور مسلک[۲۵] بنا لیے، اور اگر تیرے رب کی طرف سے پہلے ہی ایک بات طے نہ کر لی گئی ہوتی تو جس چیز میں وہ باہم اختلاف کر رہے ہیں اس کا فیصلہ کر دیا جاتا۔[۲۶]

اُس چیز سے جو وہ پیش کر رہا ہو، ممکن نہ ہوتی تو ایسے غیر معقول معیار تجویز کرنے کی ضرورت پیش آ سکتی تھی۔

۲۴ – کسی چیز کا اللہ کے علم میں نہ ہونا یہ معنی رکھتا ہے کہ وہ سرے سے موجود ہی نہیں ہے، اس لیے کہ سب کچھ جو موجود ہے اللہ کے علم میں ہے۔ پس سفارشیوں کے معدوم ہونے کے لیے یہ ایک نہایت لطیف اندازِ بیان ہے کہ اللہ تعالیٰ تو جانتا نہیں کہ زمین یا آسمان میں کوئی اس کے حضور تمھاری سفارش کرنے والا ہے، پھر یہ تم کن سفارشیوں کی اس کو خبر دے رہے ہو؟

۲۵ – تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: سورۂ بقرہ، حاشیہ ۲۳۰۔ الأنعام، حاشیہ ۲۴۔

۲۶ – یعنی اگر اللہ تعالیٰ نے پہلے ہی یہ فیصلہ نہ کر لیا ہوتا کہ حقیقت کو انسانوں کے حواس سے پوشیدہ رکھ کر ان کی عقل و فہم اور ضمیر و وجدان کو آزمائش میں ڈالا جائے گا، اور جو اس آزمائش میں ناکام ہو کر غلط راہ پر جانا چاہیں گے انھیں اس راہ پر جانے اور چلنے کا موقع دیا جائے گا، تو حقیقت کو آج ہی بے نقاب کر کے سارے اختلافات کا فیصلہ کیا جا سکتا تھا۔

یہاں یہ بات ایک بڑی غلط فہمی کو رفع کرنے کے لیے بیان کی گئی ہے۔ عام طور پر آج بھی لوگ اس اُلجھن میں ہیں اور نزولِ قرآن کے وقت بھی تھے کہ دنیا میں بہت سے مذہب پائے جاتے ہیں اور ہر مذہب والا اپنے ہی مذہب کو حق سمجھتا ہے۔ ایسی حالت میں آخر اس فیصلے کی صورت کیا ہے کہ کون حق پر ہے اور کون نہیں۔ اس کے متعلّق فرمایا جا رہا ہے کہ یہ اختلافِ مذاہب دراصل بعد کی پیداوار ہے۔ ابتدا میں تمام نوعِ انسانی کا مذہب ایک تھا اور وہی مذہب حق تھا۔ پھر اس حق میں اختلاف کر کے لوگ مختلف عقیدے اور مذہب بناتے چلے گئے۔ اب اگر اس ہنگامۂ مذاہب کا فیصلہ تمھارے نزدیک عقل و شعور کے صحیح استعمال کے بجائے صرف اسی طرح

وَيَقُوْلُوْنَ لَوْلَآ اُنْزِلَ عَلَيْهِ اٰيَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ ۚ فَقُلْ اِنَّمَا الْغَيْبُ لِلّٰهِ فَانْتَظِرُوْا ۚ اِنِّيْ مَعَكُمْ مِّنَ الْمُنْتَظِرِيْنَ ﴿۲۰﴾ ع وَاِذَآ اَذَقْنَا النَّاسَ رَحْمَةً مِّنْۢ بَعْدِ ضَرَّآءَ مَسَّتْهُمْ اِذَا لَهُمْ مَّكْرٌ فِيْٓ اٰيَاتِنَا ۭ قُلِ اللّٰهُ اَسْرَعُ

اور یہ جو وہ کہتے ہیں کہ اِس نبیؐ پر اس کے رب کی طرف سے کوئی نشانی کیوں نہ اُتاری گئی[۲۷]، تو ان سے کہو: ”غیب کا مالک و مختار تو اللہ ہی ہے، اچھا، انتظار کرو، میں بھی تمہارے ساتھ انتظار کرتا ہوں[۲۸]۔“ ع

لوگوں کا حال یہ ہے کہ مصیبت کے بعد جب ہم ان کو رحمت کا مزا چکھاتے ہیں تو فوراً ہی وہ ہماری نشانیوں کے معاملے میں چال بازیاں شروع کر دیتے ہیں[۲۹]۔ ان سے کہو: ”اللہ اپنی چال میں تم سے

ہوسکتا ہے کہ خدا خود حق کو بے نقاب کر کے سامنے لے آئے، تو یہ موجودہ دنیوی زندگی میں نہیں ہوگا۔ دُنیا کی یہ زندگی تو ہے ہی امتحان کے لیے، اور یہاں سارا امتحان اِسی بات کا ہے کہ تم حق کو دیکھے بغیر عقل و شُعور سے پہچانتے ہو یا نہیں۔

۲۷ – یعنی اس بات کی نشانی کہ یہ واقعی نبیِ برحق ہے اور جو کچھ پیش کر رہا ہے وہ بالکل دُرست ہے۔ اس سلسلے میں یہ بات پیشِ نظر رہے کہ نشانی کے لیے ان کا یہ مطالبہ کچھ اس بنا پر نہ تھا کہ وہ سچّے دل سے دعوتِ حق کو قبول کرنے اور اس کے تقاضوں کے مطابق اپنے اخلاق کو، عادت کو، نظامِ معاشرت وتمدّن کو، غرض اپنی پوری زندگی کو ڈھال لینے کے لیے تیار تھے اور بس اس وجہ سے ٹھیرے ہوئے تھے کہ نبی کی تائید میں کوئی نشانی ابھی انھوں نے ایسی نہیں دیکھی تھی جس سے انھیں اس کی نبوّت کا یقین آجائے۔ اصل بات یہ تھی کہ نشانی کا یہ مطالبہ محض ایمان نہ لانے کے لیے ایک بہانے کے طور پر پیش کیا جاتا تھا۔ جو کچھ بھی ان کو دکھایا جاتا اس کے بعد وہ یہی کہتے کہ کوئی نشانی تو ہم کو دکھائی ہی نہیں گئی۔ اس لیے کہ وہ ایمان لانا چاہتے نہ تھے۔ دنیوی زندگی کے ظاہری پہلو کو اختیار کرنے میں یہ جو آزادی ان کو حاصل تھی کہ نفس کی خواہشات ورغبات کے مطابق جس طرح چاہیں کام کریں اور جس چیز میں لذت یا فائدہ محسوس کریں اس کے پیچھے لگ جائیں، اِس کو چھوڑ کر وہ ایسی غیبی حقیقتوں (توحید و آخرت) کو ماننے کے لیے تیار نہ تھے جنھیں مان لینے کے بعد ان کو اپنا سارا نظامِ حیات مستقل اَخلاقی اُصولوں کی بندش میں باندھنا پڑ جاتا۔

۲۸ – یعنی جو کچھ اللہ نے اُتارا ہے وہ تو مَیں نے پیش کر دیا، اور جو اس نے نہیں اُتارا وہ میرے اور تمھارے لیے ”غیب“ ہے، جس پر سوائے خدا کے کسی کا اختیار نہیں، وہ چاہے تو اُتارے اور نہ چاہے تو نہ اُتارے۔ اب اگر تمھارا ایمان لانا اِسی پر موقوف ہے کہ جو کچھ خدا نے نہیں اُتارا ہے وہ اُترے تو اس کے انتظار میں بیٹھے رہو، میں بھی دیکھوں گا کہ تمھاری یہ ضد پوری کی جاتی ہے یا نہیں۔

۲۹ – یہ پھر اسی قحط کی طرف اشارہ ہے، جس کا ذکر آیات ۱۱-۱۲ میں گزر چکا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ تم نشانی آخر کس منہ سے مانگتے ہو۔ ابھی جو قحط تم پر گزرا ہے اس میں تم اپنے اُن معبودوں سے مایوس ہو گئے تھے جنھیں تم نے اللہ کے ہاں اپنا سفارشی ٹھیرا رکھا

مَكْرًا ؕ اِنَّ رُسُلَنَا يَكْتُبُوْنَ مَا تَمْكُرُوْنَ ﴿۲۱﴾ هُوَ الَّذِيْ يُسَيِّرُكُمْ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ ؕ حَتّٰۤى اِذَا كُنْتُمْ فِي الْفُلْكِ ۚ وَجَرَيْنَ بِهِمْ بِرِيْحٍ طَيِّبَةٍ وَّفَرِحُوْا بِهَا جَآءَتْهَا رِيْحٌ عَاصِفٌ وَّجَآءَهُمُ الْمَوْجُ مِنْ كُلِّ مَكَانٍ وَّظَنُّوْۤا اَنَّهُمْ اُحِيْطَ بِهِمْ ۙ دَعَوُا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ ۚ۬ لَئِنْ اَنْجَيْتَنَا مِنْ هٰذِهٖ لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الشّٰكِرِيْنَ ﴿۲۲﴾

زیادہ تیز ہے، اس کے فرشتے تمھاری سب مکّاریوں کو قلم بند کر رہے ہیں[۳۰]۔" وہ اللہ ہی ہے جو تم کو خشکی اور تری میں چلاتا ہے۔ چنانچہ جب تم کشتیوں میں سوار ہو کر بادِ موافق پر فرحاں و شاداں سفر کر رہے ہوتے ہو اور پھر یکایک بادِ مخالف کا زور ہوتا ہے اور ہر طرف سے موجوں کے تھپیڑے لگتے ہیں اور مسافر سمجھ لیتے ہیں کہ طوفان میں گھر گئے، اُس وقت سب اپنے دین کو اللہ ہی کے لیے خالص کر کے اس سے دُعائیں مانگتے ہیں کہ "اگر تُو نے ہم کو اس بلا سے نجات دے دی تو ہم شکر گزار بندے بنیں[۳۱] گے۔"

تھا اور جن کے متعلق کہا کرتے تھے کہ فُلاں آستانے کی نیاز تو تیر بہدف ہے، اور فلاں درگاہ پر چڑھاوا چڑھانے کی دیر ہے کہ مراد بر آتی ہے۔ تم نے دیکھ لیا کہ ان نام نہاد خداؤں کے ہاتھ میں کچھ نہیں ہے اور سارے اختیارات کا مالک صرف اللہ ہے۔ اسی وجہ سے تو آخرِ کار تم اللہ ہی سے دعائیں مانگنے لگے تھے۔ کیا یہ کافی نشانی نہ تھی کہ تمھیں اُس تعلیم کے برحق ہونے کا یقین آ جاتا جو محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) تم کو دے رہے ہیں؟ مگر اس نشانی کو دیکھ کر تم نے کیا کیا؟ جونہی کہ قحط دُور ہُوا اور بارانِ رحمت نے تمھاری مصیبت کا خاتمہ کر دیا، تم نے اس بلا کے آنے اور پھر اس کے دُور ہونے کے متعلق ہزار قسم کی توجیہیں اور تاویلیں (چال بازیاں) کرنی شروع کر دیں، تاکہ توحید کے ماننے سے بچ سکو اور اپنے شرک پر جمے رہ سکو۔ اب جن لوگوں نے اپنے ضمیر کو اس درجہ خراب کر لیا ہو انھیں آخر کون سی نشانی دکھائی جائے اور اس کے دکھانے سے حاصل کیا ہے؟

۳۰۔ اللہ کی چال سے مراد ہے کہ اگر تم حقیقت کو نہیں مانتے اور اس کے مطابق اپنا رویّہ دُرست نہیں کرتے تو وہ تمھیں اسی باغیانہ رَوِش پر چلتے رہنے کی چھوٹ دے دے گا، تم کو جیتے جی اپنے رزق اور اپنی نعمتوں سے نوازتا رہے گا جس سے تمھارا نشۂ زندگانی یونہی تمھیں مست کیے رکھے گا، اور اس مستی کے دوران میں جو کچھ تم کرو گے وہ سب اللہ کے فرشتے خاموشی کے ساتھ بیٹھے لکھتے رہیں گے، حتّٰی کہ اچانک موت کا پیغام آ جائے گا اور تم اپنے کرتوتوں کا حساب دینے کے لیے دھر لیے جاؤ گے۔

فَلَمَّآ اَنۡجٰىهُمۡ اِذَا هُمۡ يَبۡغُوۡنَ فِى الۡاَرۡضِ بِغَيۡرِ الۡحَـقِّ‌ ؕ يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اِنَّمَا بَغۡيُكُمۡ عَلٰٓى اَنۡفُسِكُمۡ‌ ۙ مَّتَاعَ الۡحَيٰوةِ الدُّنۡيَا‌ ۟ ثُمَّ اِلَـيۡنَا مَرۡجِعُكُمۡ فَنُـنَبِّئُكُمۡ بِمَا كُنۡتُمۡ تَعۡمَلُوۡنَ ﴿۲۳﴾ اِنَّمَا مَثَلُ الۡحَيٰوةِ الدُّنۡيَا كَمَآءٍ اَنۡزَلۡنٰهُ مِنَ السَّمَآءِ فَاخۡتَلَطَ بِهٖ نَبَاتُ الۡاَرۡضِ مِمَّا يَاۡكُلُ النَّاسُ وَالۡاَنۡعَامُ ؕ حَتّٰۤى اِذَاۤ اَخَذَتِ الۡاَرۡضُ زُخۡرُفَهَا وَازَّيَّنَتۡ وَظَنَّ اَهۡلُهَاۤ اَنَّهُمۡ قٰدِرُوۡنَ عَلَيۡهَاۤ ۙ اَتٰٮهَاۤ اَمۡرُنَا لَيۡلًا اَوۡ نَهَارًا فَجَعَلۡنٰهَا حَصِيۡدًا كَاَنۡ لَّمۡ تَغۡنَ بِالۡاَمۡسِ‌ ؕ كَذٰلِكَ نُفَصِّلُ الۡاٰيٰتِ لِقَوۡمٍ

مگر جب وہ ان کو بچا لیتا ہے تو پھر وہی لوگ حق سے منحرف ہو کر زمین میں بغاوت کرنے لگتے ہیں۔ لوگو! تمھاری یہ بغاوت اُلٹی تمھارے ہی خلاف پڑ رہی ہے۔ دُنیا کے چند روزہ مزے ہیں (لُوٹ لو)، پھر ہماری طرف تمھیں پلٹ کر آنا ہے، اُس وقت ہم تمھیں بتا دیں گے کہ تم کیا کچھ کرتے رہے ہو۔ دُنیا کی یہ زندگی (جس کے نشے میں مست ہو کر تم ہماری نشانیوں سے غفلت برت رہے ہو) اس کی مثال ایسی ہے جیسے آسمان سے ہم نے پانی برسایا تو زمین کی پیداوار، جسے آدمی اور جانور سب کھاتے ہیں، خوب گھنی ہوگئی، پھر عین اُس وقت جب کہ زمین اپنی بہار پر تھی اور کھیتیاں بنی سنوری کھڑی تھیں اور ان کے مالک سمجھ رہے تھے کہ اب ہم ان سے فائدہ اُٹھانے پر قادر ہیں، یکایک رات کو یا دن کو ہمارا حکم آ گیا اور ہم نے اسے ایسا غارت کر کے رکھ دیا کہ گویا کل وہاں کچھ تھا ہی نہیں۔ اِس طرح ہم نشانیاں کھول کھول کر پیش کرتے ہیں اُن لوگوں کے لیے جو

۳۱- یہ توحید کے برحق ہونے کی نشانی ہر انسان کے نفس میں موجود ہے۔ جب تک اسباب سازگار رہتے ہیں، انسان خدا کو بُھولا اور دنیا کی زندگی پر پُھولا رہتا ہے۔ جہاں اسباب نے ساتھ چھوڑا اور وہ سب سہارے جن کے بل پر وہ جی رہا تھا ٹوٹ گئے، پھر کٹّے سے کٹّے مشرک اور سخت سے سخت دہریّے کے قلب سے بھی یہ شہادت اُبلنی شروع ہو جاتی ہے کہ اس سارے عالَم اسباب پر کوئی خدا کارفرما ہے اور وہ ایک ہی خدائے غالب و توانا ہے۔ (مُلاحظہ ہو: الانعام، حاشیہ ۲۹)

يَّتَفَكَّرُوْنَ ﴿٢٤﴾ وَاللّٰهُ يَدْعُوْٓا اِلٰى دَارِ السَّلٰمِ ؕ وَيَهْدِىْ مَنْ يَّشَآءُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴿٢٥﴾ لِلَّذِيْنَ اَحْسَنُوا الْحُسْنٰى وَزِيَادَةٌ ؕ وَلَا يَرْهَقُ وُجُوْهَهُمْ قَتَرٌ وَّلَا ذِلَّةٌ ؕ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿٢٦﴾ وَالَّذِيْنَ كَسَبُوا السَّيِّاٰتِ جَزَآءُ سَيِّئَةٍ بِمِثْلِهَا ۙ وَتَرْهَقُهُمْ ذِلَّةٌ ؕ مَا لَهُمْ مِّنَ اللّٰهِ مِنْ عَاصِمٍ ۚ كَاَنَّمَآ اُغْشِيَتْ وُجُوْهُهُمْ قِطَعًا مِّنَ الَّيْلِ مُظْلِمًا ؕ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿٢٧﴾

سوچنے سمجھنے والے ہیں۔ (تم اِس ناپائدار زندگی کے فریب میں مبتلا ہو رہے ہو) اور اللہ تمھیں دارالسّلام کی طرف دعوت دے رہا ہے[32]۔ (ہدایت اُس کے اختیار میں ہے) جس کو وہ چاہتا ہے سیدھا راستہ دکھا دیتا ہے۔ جن لوگوں نے بھلائی کا طریقہ اختیار کیا، ان کے لیے بھلائی ہے اور مزید فضل[33]۔ ان کے چہروں پر رُوسیاہی اور ذلّت نہ چھائے گی۔ وہ جنت کے مستحق ہیں جہاں وہ ہمیشہ رہیں گے۔ اور جن لوگوں نے برائیاں کمائیں، ان کی بُرائی جیسی ہے ویسا ہی وہ بدلہ پائیں[34] گے، ذلّت ان پر مسلّط ہوگی، کوئی اللہ سے ان کو بچانے والا نہ ہوگا، ان کے چہروں پر ایسی تاریکی چھائی[35] ہوئی ہو گی جیسے رات کے سیاہ پردے ان پر پڑے ہوئے ہوں، وہ دوزخ کے مستحق ہیں جہاں وہ ہمیشہ رہیں گے۔

۳۲- یعنی دُنیا میں زندگی بسر کرنے کے اُس طریقے کی طرف جو آخرت کی زندگی میں تم کو دارالسّلام کا مستحق بنائے۔ دارالسّلام سے مراد ہے جنّت، اور اس کے معنٰی ہیں سلامتی کا گھر، وہ جگہ جہاں کوئی آفت، کوئی نقصان، کوئی رنج اور کوئی تکلیف نہ ہو۔

۳۳- یعنی ان کو صرف ان کی نیکی کے مطابق ہی اجر نہیں ملے گا بلکہ اللہ اپنے فضل سے ان کو مزید انعام بھی بخشے گا۔

۳۴- یعنی نیکوکاروں کے برعکس بدکاروں کے ساتھ معاملہ یہ ہوگا کہ جتنی بدی ہے اتنی ہی سزا دے دی جائے گی۔ ایسا نہ ہوگا کہ جرم سے ذرّہ برابر بھی زیادہ سزا دی جائے۔ (مزید تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: النمل، حاشیہ ۱۰۹ الف)

۳۵- وہ تاریکی جو مجرموں کے چہرے پر پکڑے جانے اور بچاؤ سے مایوس ہو جانے کے بعد چھا جاتی ہے۔

وَيَوْمَ نَحْشُرُهُمْ جَمِيعًا ثُمَّ نَقُولُ لِلَّذِينَ أَشْرَكُوا مَكَانَكُمْ أَنْتُمْ وَشُرَكَاؤُكُمْ ۚ فَزَيَّلْنَا بَيْنَهُمْ ۖ وَقَالَ شُرَكَاؤُهُمْ مَا كُنْتُمْ إِيَّانَا تَعْبُدُونَ ﴿٢٨﴾ فَكَفَىٰ بِاللَّهِ شَهِيدًا بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ إِنْ كُنَّا عَنْ عِبَادَتِكُمْ لَغَافِلِينَ ﴿٢٩﴾ هُنَالِكَ تَبْلُو كُلُّ نَفْسٍ مَا أَسْلَفَتْ ۚ وَرُدُّوا إِلَى اللَّهِ مَوْلَاهُمُ الْحَقِّ ۖ وَضَلَّ عَنْهُمْ مَا كَانُوا يَفْتَرُونَ ﴿٣٠﴾ ع

النصف ع ۸

جس روز ہم ان سب کو ایک ساتھ (اپنی عدالت میں) اکٹھا کریں گے، پھر ان لوگوں سے جنھوں نے شرک کیا ہے کہیں گے کہ ٹھیر جاؤ تم بھی اور تمھارے بنائے ہوئے شریک بھی، پھر ہم ان کے درمیان سے اجنبیّت کا پردہ ہٹا دیں[36] گے اور ان کے شریک کہیں گے کہ ”تم ہماری عبادت تو نہیں کرتے تھے۔ ہمارے اور تمھارے درمیان اللہ کی گواہی کافی ہے کہ (تم اگر ہماری عبادت کرتے بھی تھے تو) ہم تمھاری اس عبادت سے بالکل بے خبر[37] تھے“، اُس وقت ہر شخص اپنے کیے کا مزا چکھ لے گا، سب اپنے حقیقی مالک کی طرف پھیر دیے جائیں گے اور وہ سارے جھوٹ جو انھوں نے گھڑ رکھے تھے، گم ہو جائیں گے۔ ع

۳۶- متن میں فَزَیَّلْنَا بَیْنَھُمْ کے الفاظ ہیں۔ اس کا مفہوم بعض مفسرین نے یہ لیا ہے کہ ہم ان کا باہمی ربط و تعلّق توڑ دیں گے تاکہ کسی تعلّق کی بنا پر وہ ایک دوسرے کا لحاظ نہ کریں۔ لیکن یہ معنیٰ عربی محاورے کے مطابق نہیں ہیں۔ محاورۂ عرب کی رُو سے اس کا صحیح مطلب یہ ہے کہ ہم ان کے درمیان تمیز پیدا کردیں گے، یا ان کو ایک دوسرے سے مُمیَّز کردیں گے۔ اسی معنیٰ کو ادا کرنے کے لیے ہم نے یہ طرزِ بیان اختیار کیا ہے کہ ”ان کے درمیان سے اجنبیّت کا پردہ ہٹا دیں گے“، یعنی مشرکین اور اُن کے معبود آمنے سامنے کھڑے ہوں گے اور دونوں گروہوں کی امتیازی حیثیت ایک دوسرے پر واضح ہوگی، مشرکین جان لیں گے کہ یہ ہیں وہ جن کو ہم دُنیا میں معبود بنائے ہوئے تھے، اور ان کے معبُود جان لیں گے کہ یہ ہیں وہ جنھوں نے ہمیں اپنا معبود بنا رکھا تھا۔

۳۷- یعنی وہ تمام فرشتے جن کو دُنیا میں دیوی اور دیوتا قرار دے کر پُوجا گیا، اور وہ تمام جِنّ، ارواح، اسلاف، اجداد، انبیا، اولیا، شہدا وغیرہ جن کو خدائی صفات میں شریک ٹھیرا کر وہ حقوق انھیں ادا کیے گئے جو دراصل خدا کے حُقوق تھے، وہاں اپنے پرستاروں سے صاف کہہ دیں گے کہ ہمیں تو خبر تک نہ تھی کہ تم ہماری عبادت بجا لا رہے ہو۔ تمھاری کوئی دعا، کوئی التجا، کوئی پکار اور فریاد، کوئی نذر و نیاز، کوئی چڑھاوے کی چیز، کوئی تعریف و مدح اور ہمارے نام کی جاپ، اور کوئی سجدہ ریزی و آستانہ بوسی و درگاہ گردی

قُلْ مَنْ يَّرْزُقُكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ اَمَّنْ يَّمْلِكُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَمَنْ يُّخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَيُخْرِجُ الْمَيِّتَ مِنَ الْحَيِّ وَمَنْ يُّدَبِّرُ الْاَمْرَ ؕ فَسَيَقُوْلُوْنَ اللّٰهُ ۚ فَقُلْ اَفَلَا تَتَّقُوْنَ ﴿۳۱﴾ فَذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمُ الْحَقُّ ۚ فَمَاذَا بَعْدَ الْحَقِّ اِلَّا الضَّلٰلُ ۚۖ فَاَنّٰى تُصْرَفُوْنَ ﴿۳۲﴾ كَذٰلِكَ حَقَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ عَلَى الَّذِيْنَ فَسَقُوْۤا اَنَّهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ﴿۳۳﴾

اِن سے پُوچھو: کون تم کو آسمان اور زمین سے رزق دیتا ہے؟ یہ سماعت اور بینائی کی قوتیں کس کے اختیار میں ہیں؟ کون بے جان میں سے جان دار کو اور جان دار میں سے بے جان کو نکالتا ہے؟ کون اِس نظمِ عالم کی تدبیر کر رہا ہے؟ وہ ضرور کہیں گے کہ اللہ۔ کہو: پھر تم (حقیقت کے خلاف چلنے سے) پرہیز نہیں کرتے؟ تب تو یہی اللہ تمھارا حقیقی رب ہے[۳۸]۔ پھر حق کے بعد گمراہی کے سوا اور کیا باقی رہ گیا؟ آخر یہ تم کدھر پھرائے جا رہے ہو؟[۳۹] (اے نبیؐ! دیکھو) اس طرح نافرمانی اختیار کرنے والوں پر تمھارے رب کی بات صادق آگئی کہ وہ مان کر نہ دیں[۴۰] گے۔

ہم تک نہیں پہنچی۔

۳۸- یعنی اگر یہ سارے کام اللہ کے ہیں، جیسا کہ تم خود مانتے ہو، تب تو تمھارا حقیقی پروردگار، مالک، آقا، اور تمھاری بندگی وعبادت کا حق دار اللہ ہی ہُوا۔ یہ دوسرے جن کا اِن کاموں میں کوئی حصّہ نہیں، آخر رُبوبیت میں کہاں سے شریک ہو گئے؟

۳۹- خیال رہے کہ خطاب عام لوگوں سے ہے اور ان سے سوال یہ نہیں کیا جا رہا ہے کہ ”تم کدھر پھرے جاتے ہو“ بلکہ یہ ہے کہ ”تم کدھر پھرائے جا رہے ہو“۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ کوئی ایسا گمراہ کُن شخص یا گروہ موجود ہے جو لوگوں کو صحیح رُخ سے ہٹا کر غلط رُخ پر پھیر رہا ہے۔ اسی بنا پر لوگوں سے اپیل یہ کیا جا رہا ہے کہ تم اندھے بن کر غلط رہنمائی کرنے والوں کے پیچھے کیوں چلے جا رہے ہو، اپنی گرہ کی عقل سے کام لے کر سوچتے کیوں نہیں کہ جب حقیقت یہ ہے تو آخر یہ تم کو کدھر چلایا جا رہا ہے۔ یہ طرزِ سوال جگہ جگہ ایسے مواقع پر قرآن میں اختیار کیا گیا ہے، اور ہر جگہ گمراہ کرنے والوں کا نام لینے کے بجائے ان کو صیغۂ مجہول کے پردے میں چھپا دیا گیا ہے، تاکہ ان کے معتقدین ٹھنڈے دل سے اپنے معاملے پر غور کر سکیں، اور کسی کو یہ کہہ کر انھیں اشتعال دلانے اور ان کا دماغی توازن بگاڑ دینے کا موقع نہ ملے کہ دیکھو، یہ تمھارے بزرگوں اور پیشواؤں پر چوٹیں کی جا رہی ہیں۔ اس میں حکمتِ تبلیغ کا ایک اہم نکتہ پوشیدہ ہے جس سے غافل نہ

قُلْ هَلْ مِنْ شُرَكَآئِكُمْ مَّنْ يَّبْدَؤُا الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيْدُهٗ ؕ قُلِ اللّٰهُ يَبْدَؤُا الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيْدُهٗ فَاَنّٰى تُؤْفَكُوْنَ ﴿۳۴﴾ قُلْ هَلْ مِنْ شُرَكَآئِكُمْ مَّنْ يَّهْدِيْٓ اِلَى الْحَقِّ ؕ

اِن سے پوچھو: تمھارے ٹھیرائے ہوئے شریکوں میں کوئی ہے جو تخلیق کی ابتدا بھی کرتا ہو اور پھر اس کا اعادہ بھی کرے؟ —— کہو: وہ صرف اللہ ہے جو تخلیق کی ابتدا بھی کرتا ہے اور اس کا اعادہ[41] بھی، پھر تم یہ کس اُلٹی راہ پر چلائے جا رہے[42] ہو؟

اِن سے پوچھو: تمھارے ٹھیرائے ہوئے شریکوں میں کوئی ایسا بھی ہے جو حق کی طرف رہنمائی کرتا[43] ہو؟ ——

رہنا چاہیے۔

۴۰ – یعنی ایسی کُھلی کُھلی اور عام فہم دلیلوں سے بات سمجھائی جاتی ہے، لیکن جنھوں نے نہ ماننے کا فیصلہ کر لیا ہے وہ اپنی ضد کی بنا پر کسی طرح مان کر نہیں دیتے۔

۴۱ – تخلیق کی ابتدا کے متعلّق تو مشرکین مانتے ہی تھے کہ یہ صرف اللہ کا کام ہے، ان کے شریکوں میں سے کسی کا اِس کام میں کوئی حصّہ نہیں۔ رہا تخلیق کا اعادہ، تو ظاہر ہے کہ جو ابتداءً پیدا کرنے والا ہے وہی اس عملِ پیدایش کا اعادہ بھی کر سکتا ہے، مگر جو ابتداءً ہی پیدا کرنے پر قادر نہ ہو وہ کس طرح اعادۂ پیدایش پر قادر ہو سکتا ہے۔ یہ بات اگرچہ صریحاً ایک معقول بات ہے، اور خود مشرکین کے دل بھی اندر سے اس کی گواہی دیتے تھے کہ بات بالکل ٹھکانے کی ہے، لیکن انھیں اس کا اقرار کرنے میں اس بنا پر تأمّل تھا کہ اسے مان لینے کے بعد انکارِ آخرت مشکل ہو جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اُوپر کے سوالات پر تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ وہ خود کہیں گے کہ یہ کام اللہ کے ہیں، مگر یہاں اس کے بجائے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ارشاد ہوتا ہے کہ تم ڈنکے کی چوٹ کہو کہ یہ ابتدائے خلق اور اعادۂ خلق کا کام بھی اللہ ہی کا ہے۔

۴۲ – یعنی جب تمھاری ابتدا کا سرا بھی اللہ کے ہاتھ میں ہے اور انتہا کا سرا بھی اسی کے ہاتھ میں، تو خود اپنے خیر خواہ بن کر ذرا سوچو کہ آخر تمھیں یہ کیا باور کرایا جا رہا ہے کہ ان دونوں سروں کے بیچ میں اللہ کے سوا کسی اور کو تمھاری بندگیوں اور نیاز مندیوں کا حق پہنچ گیا ہے۔

۴۳ – یہ ایک نہایت اہم سوال ہے جس کو ذرا تفصیل کے ساتھ سمجھ لینا چاہیے۔ دُنیا میں انسان کی ضرورتوں کا دائرہ صرف اسی حد تک محدود نہیں ہے کہ اس کو کھانے، پینے، پہننے اور زندگی بسر کرنے کا سامان بہم پہنچے اور آفات، مصائب اور نقصانات سے وہ محفوظ رہے۔ بلکہ اُس کی ایک ضرورت (اور درحقیقت سب سے بڑی ضرورت) یہ بھی ہے کہ اسے دُنیا میں زندگی بسر کرنے کا صحیح طریقہ معلوم ہو اور وہ جانے کہ اپنی ذات کے ساتھ، اپنی قوتوں اور قابلیتوں کے ساتھ، اُس سروسامان کے ساتھ جو رُوئے زمین پر اُس کے تصرّف میں ہے،

قُلِ اللّٰهُ يَهْدِيْ لِلْحَقِّ ۭ اَفَمَنْ يَّهْدِيْٓ اِلَى الْحَقِّ اَحَقُّ

کہو: وہ صرف اللہ ہے جو حق کی طرف رہنمائی کرتا ہے۔ پھر بھلا بتاؤ، جو حق کی طرف رہنمائی کرتا ہے وہ اِس کا زیادہ مستحق ہے

اُن بے شمار انسانوں کے ساتھ جن سے مختلف حیثیتوں میں اس کو سابقہ پیش آتا ہے، اور مجموعی طور پر اس نظامِ کائنات کے ساتھ جس کے ماتحت رہ کر ہی بہرحال اس کو کام کرنا ہے، وہ کیا اور کس طرح معاملہ کرے جس سے اس کی زندگی بحیثیتِ مجموعی کامیاب ہو اور اس کی کوششیں اور محنتیں غلط راہوں میں صَرف ہو کر تباہی و بربادی پر مُنتج نہ ہوں۔ اسی صحیح طریقے کا نام ''حق'' ہے اور جو رہنمائی اس طریقے کی طرف انسان کو لے جائے وہی ''ہدایتِ حق'' ہے۔ اب قرآن تمام مشرکین سے اور اُن سب لوگوں سے جو پیغمبر کی تعلیم کو ماننے سے انکار کرتے ہیں، یہ پوچھتا ہے کہ تم خدا کے سوا جن جن کی بندگی کرتے ہو، ان میں کوئی ہے جو تمھارے لیے ''ہدایتِ حق'' حاصل کرنے کا ذریعہ بنتا ہو یا بن سکتا ہو؟ ـــــ ظاہر ہے کہ اس کا جواب نفی کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ اس لیے کہ انسان خدا کے سوا جن کی بندگی کرتا ہے وہ دو بڑی اقسام پر منقسم ہیں:

ایک، وہ دیویاں، دیوتا اور زندہ یا مردہ انسان جن کی پرستش کی جاتی ہے۔ سو اُن کی طرف تو انسان کا رُجوع صرف اس غرض کے لیے ہوتا ہے کہ فوق الفطری طریقے سے وہ اس کی حاجتیں پوری کریں اور اس کو آفات سے بچائیں۔ رہی ہدایتِ حق، تو وہ نہ کبھی ان کی طرف سے آئی، نہ کبھی کسی مشرک نے اس کے لیے اُن کی طرف رُجوع کیا، اور نہ کوئی مشرک یہ کہتا ہے کہ اس کے یہ معبود اُسے اخلاق، معاشرت، تمدّن، معیشت، سیاست، قانون، عدالت وغیرہ کے اُصول سکھاتے ہیں۔

دوسرے، وہ انسان جن کے بنائے ہوئے اُصولوں اور قوانین کی پیروی و اطاعت کی جاتی ہے۔ سو وہ رہنما تو ضرور ہیں مگر سوال یہ ہے کہ کیا فی الواقع وہ ''رہنمائے حق'' بھی ہیں یا ہو سکتے ہیں؟ کیا اُن میں سے کسی کا علم بھی اُن تمام حقائق پر حاوی ہے جن کو جاننا انسانی زندگی کے صحیح اصول وضع کرنے کے لیے ضروری ہے؟ کیا ان میں سے کسی کی نظر بھی اس پورے دائرے پر پھیلتی ہے جس میں انسانی زندگی سے تعلّق رکھنے والے مسائل پھیلے ہوئے ہیں؟ کیا ان میں سے کوئی بھی اُن کمزوریوں سے، اُن تعصّبات سے، اُن شخصی یا گروہی دلچسپیوں سے، اُن اغراض و خواہشات سے، اور اُن رُجحانات و میلانات سے بالاتر ہے جو انسانی معاشرے کے لیے مُنصفانہ قوانین بنانے میں مانع ہوتے ہیں؟ اگر جواب نفی میں ہے، اور ظاہر ہے کہ کوئی صحیح الدماغ آدمی ان سوالات کا جواب اثبات میں نہیں دے سکتا، تو آخر یہ لوگ ''ہدایتِ حق'' کا سرچشمہ کیسے ہو سکتے ہیں؟

اسی بنا پر قرآن یہ سوال کرتا ہے کہ لوگو! تمھارے اِن مذہبی معبُودوں اور تمدّنی خداؤں میں کوئی ایسا بھی ہے جو راہِ راست کی طرف تمھاری رہنمائی کرنے والا ہو؟ اُوپر کے سوالات کے ساتھ مل کر یہ آخری سوال دین و مذہب کے پورے مسئلے کا فیصلہ کر دیتا ہے۔ انسان کی ساری ضرورتیں دو ہی نوعیت کی ہیں: ایک نوعیّت کی ضروریات یہ ہیں کہ کوئی اس کا پروردگار ہو، کوئی مَلجا و ماویٰ ہو، کوئی دعاؤں کا سننے والا اور حاجتوں کا پورا کرنے والا ہو جس کا مستقل سہارا اس عالمِ اسباب کے بے ثبات سہاروں کے درمیان رہتے ہوئے وہ تھام سکے۔ سو اُوپر کے سوالات نے فیصلہ کر دیا کہ اس ضرورت کو پورا کرنے والا خدا کے سوا کوئی نہیں ہے۔ دوسری نوعیت کی ضروریات یہ ہیں کہ کوئی ایسا رہنما ہو

اَنْ يُّتَّبَعَ اَمَّنْ لَّا يَهِدِّيْٓ اِلَّآ اَنْ يُّهْدٰى ۚ فَمَا لَكُمْ ۣ كَيْفَ تَحْكُمُوْنَ ﴿۳۵﴾ وَمَا يَتَّبِعُ اَكْثَرُهُمْ اِلَّا ظَنًّا ۭ اِنَّ الظَّنَّ لَا يُغْنِيْ مِنَ الْحَقِّ شَيْـــًٔا ۭ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌۢ بِمَا يَفْعَلُوْنَ ﴿۳۶﴾ وَمَا كَانَ هٰذَا الْقُرْاٰنُ اَنْ يُّفْتَرٰى مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلٰكِنْ تَصْدِيْقَ الَّذِيْ بَيْنَ يَدَيْهِ وَتَفْصِيْلَ الْكِتٰبِ لَا رَيْبَ فِيْهِ مِنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۳۷﴾ ۣ

کہ اس کی پیروی کی جائے یا وہ جو خود راہ نہیں پاتا اِلّا یہ کہ اس کی رہنمائی کی جائے؟ آخر تمھیں ہو کیا گیا ہے، کیسے اُلٹے اُلٹے فیصلے کرتے ہو؟

حقیقت یہ ہے کہ اِن میں سے اکثر لوگ محض قیاس وگمان کے پیچھے چلے جا رہے ہیں،[۴۴] حالاں کہ گمان حق کی ضرورت کو کچھ بھی پُورا نہیں کرتا۔ جو کچھ یہ کر رہے ہیں، اللہ اُس کو خوب جانتا ہے۔

اور یہ قرآن وہ چیز نہیں ہے جو اللہ کی وحی و تعلیم کے بغیر تصنیف کر لیا جائے۔ بلکہ یہ تو جو کچھ پہلے آ چکا تھا اس کی تصدیق اور الکتاب کی تفصیل ہے۔[۴۵] اِس میں کوئی شک نہیں کہ یہ فرماں روائے کائنات کی طرف سے ہے۔

جو دُنیا میں زندگی بسر کرنے کے صحیح اُصول بتائے اور جس کے دیے ہوئے قوانینِ حیات کی پیروی پورے اعتماد واطمینان کے ساتھ کی جا سکے۔ سو اس آخری سوال نے اُس کا فیصلہ بھی کر دیا کہ وہ بھی صرف خدا ہی ہے۔ اس کے بعد ضد اور ہٹ دھرمی کے سوا کوئی چیز باقی نہیں رہ جاتی جس کی بنا پر انسان مشرکانہ مذاہب اور لادینی (Secular) اُصولِ تمدّن واخلاق و سیاست سے چمٹا رہے۔

۴۴ – یعنی جنھوں نے مذاہب بنائے، جنھوں نے فلسفے تصنیف کیے، اور جنھوں نے قوانینِ حیات تجویز کیے، انھوں نے بھی یہ سب کچھ علم کی بنا پر نہیں بلکہ گمان وقیاس کی بنا پر کیا، اور جنھوں نے ان مذہبی اور دنیوی رہنماؤں کی پیروی کی، انھوں نے بھی جان کر اور سمجھ کر نہیں بلکہ محض اس گمان کی بنا پر اُن کا اتباع اختیار کر لیا کہ ایسے بڑے بڑے لوگ جب یہ کہتے ہیں اور باپ دادا ان کو مانتے چلے آ رہے ہیں اور ایک دنیا ان کی پیروی کر رہی ہے تو ضرور ٹھیک ہی کہتے ہوں گے۔

۴۵ – ''جو کچھ پہلے آ چکا تھا اس کی تصدیق ہے''، یعنی ابتدا سے جو اُصولی تعلیمات انبیا علیہم السلام کی معرفت انسان کو بھیجی جاتی رہی ہیں، یہ قرآن اُن سے ہٹ کر کوئی نئی چیز نہیں پیش کر رہا ہے بلکہ انھی کی تصدیق و توثیق کر رہا ہے۔ اگر یہ کسی نئے مذہب کے بانی کی ذہنی اُپج کا نتیجہ ہوتا تو اس میں ضرور یہ کوشش پائی جاتی کہ پرانی صداقتوں کے ساتھ کچھ اپنا نرالا رنگ بھی ملا کر اپنی شانِ امتیاز نمایاں کی جائے۔

اَمۡ يَقُوۡلُوۡنَ افۡتَرٰٮهُ‌ ؕ قُلۡ فَاۡتُوۡا بِسُوۡرَةٍ مِّثۡلِهٖ وَادۡعُوۡا مَنِ اسۡتَطَعۡتُمۡ مِّنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ اِنۡ كُنۡتُمۡ صٰدِقِيۡنَ ﴿۳۸﴾ بَلۡ كَذَّبُوۡا بِمَا لَمۡ يُحِيۡطُوۡا بِعِلۡمِهٖ وَلَمَّا يَاۡتِهِمۡ تَاۡوِيۡلُهٗ‌ ؕ كَذٰلِكَ كَذَّبَ الَّذِيۡنَ

کیا یہ لوگ کہتے ہیں کہ پیغمبرؐ نے اسے خود تصنیف کر لیا ہے؟ کہو: "اگر تم اپنے اس الزام میں سچّے ہو تو ایک سُورت اس جیسی تصنیف کر لاؤ اور ایک خدا کو چھوڑ کر جس جس کو بُلا سکتے ہو، مدد کے لیے بلا لو۔"[۴۶] اصل یہ ہے کہ جو چیز اِن کے علم کی گرفت میں نہیں آئی اور جس کا مآل بھی ان کے سامنے نہیں آیا، اس کو انھوں نے (خواہ مخواہ اٹکل پچّو) جھٹلا دیا۔[۴۷] اِسی طرح تو ان سے پہلے کے لوگ بھی

"الکتاب کی تفصیل ہے"، یعنی اُن اُصولی تعلیمات کو جو تمام کُتبِ آسمانی کا لُبِّ لُباب (الکتاب) ہیں، اس میں پھیلا کر دلائل و شواہد کے ساتھ، تلقین و تفہیم کے ساتھ، تشریح و توضیح کے ساتھ، اور عملی حالات پر انطباق کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔

۴۶ — عام طور پر لوگ سمجھتے ہیں کہ یہ چیلنج محض قرآن کی فصاحت و بلاغت اور اس کی ادبی خوبیوں کے لحاظ سے تھا۔ اعجازِ قرآن پر جس انداز سے بحثیں کی گئی ہیں، اس سے یہ غلط فہمی پیدا ہونی کچھ بعید بھی نہیں ہے۔ لیکن قرآن کا مقام اس سے بلند تر ہے کہ وہ اپنی یکتائی و بے نظیری کے دعوے کی بنیاد محض اپنے لفظی محاسن پر رکھے۔ بلا شبہ قرآن اپنی زبان کے لحاظ سے بھی لاجواب ہے، مگر وہ اصل چیز جس کی بنا پر یہ کہا گیا ہے کہ انسانی دماغ ایسی کتاب تصنیف نہیں کر سکتا، اس کے مضامین اور اس کی تعلیمات ہیں۔ اس میں اعجاز کے جو جو پہلو ہیں اور جن وُجوہ سے ان کا مِن جانبِ اللہ ہونا یقینی اور انسان کا ایسی تصنیف پر قادر ہونا غیر ممکن ہے، ان کو خود قرآن میں مختلف مواقع پر بیان کر دیا گیا ہے، اور ہم ایسے تمام مقامات کی تشریح پہلے بھی کرتے رہے ہیں اور آیندہ بھی کریں گے۔ اس لیے یہاں بخوفِ طوالت اس بحث سے اجتناب کیا جاتا ہے۔ (تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: الطّور، حاشیہ ۲۶ و ۲۷)

۴۷ — تکذیب یا تو اس بنیاد پر کی جا سکتی تھی کہ ان لوگوں کو اس کتاب کا ایک جعلی کتاب ہونا تحقیقی طور پر معلوم ہوتا، یا پھر اس بنا پر وہ معقول ہو سکتی تھی کہ جو حقیقتیں اس میں بیان کی گئی ہیں اور جو خبریں اس میں دی گئی ہیں وہ غلط ثابت ہو جاتیں۔ لیکن ان دونوں وجوہِ تکذیب میں سے کوئی وجہ بھی یہاں موجود نہیں ہے۔ نہ کوئی شخص یہ کہہ سکتا ہے کہ وہ از رُوئے علم جانتا ہے کہ یہ کتاب گھڑ کر خدا کی طرف منسوب کی گئی ہے۔ نہ کسی نے پردۂ غیب کے پیچھے جھانک کر یہ دیکھ لیا ہے کہ واقعی بہت سے خدا موجود ہیں اور یہ کتاب خواہ مخواہ ایک خدا کی خبر سنا رہی ہے، یا فی الواقع خدا اور فرشتوں اور وحی وغیرہ کی کوئی حقیقت نہیں ہے اور اس کتاب میں خواہ مخواہ یہ افسانہ بنا لیا گیا ہے۔ نہ کسی نے مر کر یہ دیکھ لیا ہے کہ دوسری زندگی اور اس کے حساب کتاب اور جزا و سزا کی ساری خبریں جو اس کتاب میں دی گئی ہیں، غلط ہیں۔ لیکن اس کے باوجود نرے شک اور گمان کی بنیاد پر اس شان سے اس کی تکذیب کی جا رہی ہے

مِنْ قَبْلِهِمْ فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۳۹﴾ وَمِنْهُمْ مَّنْ يُّؤْمِنُ بِهٖ وَمِنْهُمْ مَّنْ لَّا يُؤْمِنُ بِهٖ ؕ وَرَبُّكَ اَعْلَمُ بِالْمُفْسِدِيْنَ ﴿۴۰﴾ وَاِنْ كَذَّبُوْكَ فَقُلْ لِّيْ عَمَلِيْ وَلَكُمْ عَمَلُكُمْ ۚ اَنْتُمْ بَرِيْٓـُٔوْنَ مِمَّآ اَعْمَلُ وَاَنَا بَرِيْٓءٌ مِّمَّا تَعْمَلُوْنَ ﴿۴۱﴾ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّسْتَمِعُوْنَ اِلَيْكَ ؕ اَفَاَنْتَ تُسْمِعُ الصُّمَّ وَلَوْ كَانُوْا لَا يَعْقِلُوْنَ ﴿۴۲﴾

ع ۴/۱۰ ۹

جھُٹلا چکے ہیں، پھر دیکھ لو اُن ظالموں کا کیا انجام ہُوا۔ اِن میں سے کچھ لوگ ایمان لائیں گے اور کچھ نہیں لائیں گے، اور تیرا رب اُن مفسدوں کو خوب جانتا ہے۔[۴۸] ع اگر یہ تجھے جھُٹلاتے ہیں تو کہہ دے کہ "میرا عمل میرے لیے ہے اور تمھارا عمل تمھارے لیے، جو کچھ میں کرتا ہوں اس کی ذمّہ داری سے تم بَری ہو اور جو کچھ تم کر رہے ہو اس کی ذمّہ داری سے میں بَری ہوں۔[۴۹]"

ان میں بہت سے لوگ ہیں جو تیری باتیں سنتے ہیں مگر کیا تُو بہروں کو سنائے گا خواہ وہ کچھ نہ سمجھتے ہوں؟[۵۰]

کہ گویا علمی طور پر اس کے جعلی اور غلط ہونے کی تحقیق کر لی گئی ہے۔

۴۸ – ایمان نہ لانے والوں کے متعلق فرمایا جا رہا ہے کہ "خدا ان مُفسِدوں کو خوب جانتا ہے"۔ یعنی وہ دُنیا کا منہ تو یہ باتیں بنا کر بند کر سکتے ہیں کہ صاحب! ہماری سمجھ میں بات نہیں آتی، اس لیے نیک نیتی کے ساتھ ہم اسے نہیں مانتے، لیکن خدا جو قلب وضمیر کے چھُپے ہوئے رازوں سے واقف ہے، وہ ان میں سے ایک ایک شخص کے متعلّق جانتا ہے کہ کس کس طرح اس نے اپنے دل ودماغ پر قفل چڑھائے، اپنے آپ کو غفلتوں میں گم کیا، اپنے ضمیر کی آواز کو دبایا، اپنے قلب میں حق کی شہادت کو اُبھرنے سے روکا، اپنے ذہن سے قبولِ حق کی صلاحیت کو مٹایا، سُن کر نہ سنا، سمجھتے ہوئے نہ سمجھنے کی کوشش کی، اور حق کے مقابلے میں اپنے تعصّبات کو، اپنے دنیوی مفاد کو، اپنی باطل سے اُلجھی ہوئی اغراض کو اور اپنے نفس کی خواہشوں اور رغبتوں کو ترجیح دی۔ اسی بنا پر وہ "معصوم گمراہ" نہیں ہیں بلکہ درحقیقت مفسد ہیں۔

۴۹ – یعنی خواہ مخواہ جھگڑے اور کج بحثیاں کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ اگر میں افترا پردازی کر رہا ہوں تو اپنے عمل کا میں خود ذمّہ دار ہوں، تم پر اس کی کوئی ذمّہ داری نہیں۔ اور اگر تم سچّی بات کو جھٹلا رہے ہو تو میرا کچھ نہیں بگاڑتے اپنا ہی کچھ بگاڑ رہے ہو۔

۵۰ – ایک سننا تو اس طرح کا ہوتا ہے جیسے جانور بھی آواز سن لیتے ہیں۔ دوسرا سُننا وہ ہوتا ہے جس میں معنیٰ کی طرف توجہ ہو

وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّنْظُرُ اِلَيْكَ ۭ اَفَاَنْتَ تَهْدِي الْعُمْيَ وَلَوْ كَانُوْا لَا يُبْصِرُوْنَ ﴿۴۳﴾
اِنَّ اللّٰهَ لَا يَظْلِمُ النَّاسَ شَيْـــًٔا وَّلٰكِنَّ النَّاسَ اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ ﴿۴۴﴾

اِن میں بہت سے لوگ ہیں جو تجھے دیکھتے ہیں، مگر کیا تو اندھوں کو راہ بتائے گا خواہ انھیں کچھ نہ سُوجھتا ہو؟[۵۱] حقیقت یہ ہے کہ اللہ لوگوں پر ظلم نہیں کرتا، لوگ خود ہی اپنے اُوپر ظلم کرتے ہیں۔[۵۲] (آج یہ دُنیا کی زندگی میں

اور یہ آمادگی پائی جاتی ہو کہ بات اگر معقول ہوگی تو اسے مان لیا جائے گا۔ جو لوگ کسی تعصّب میں مبتلا ہوں، اور جنھوں نے پہلے سے فیصلہ کر لیا ہو کہ اپنے موروثی عقیدوں اور طریقوں کے خلاف اور اپنے نفس کی رغبتوں اور دلچسپیوں کے خلاف کوئی بات، خواہ وہ کیسی ہی معقول ہو، مان کر نہ دیں گے، وہ سب کچھ سن کر بھی کچھ نہیں سنتے۔ اسی طرح وہ لوگ بھی کچھ سن کر نہیں دیتے جو دُنیا میں جانوروں کی طرح غفلت کی زندگی بسر کرتے ہیں اور چَرنے چُگنے کے سوا کسی چیز سے کوئی دلچسپی نہیں رکھتے، یا نفس کی لذتوں اور خواہشوں کے پیچھے ایسے مست ہوتے ہیں کہ انھیں اس بات کی کوئی فکر ہی نہیں ہوتی کہ ہم یہ جو کچھ کر رہے ہیں یہ صحیح بھی ہے یا نہیں۔ ایسے سب لوگ کانوں کے تو بہرے نہیں ہوتے مگر دل کے بہرے ہوتے ہیں۔

۵۱ – یہاں بھی وہی بات فرمائی گئی ہے جو اُوپر کے فقرے میں ہے۔ سر کی آنکھیں کھلی ہونے سے کچھ فائدہ نہیں، ان سے تو جانور بھی آخر دیکھتا ہی ہے۔ اصل چیز دل کی آنکھوں کا کُھلا ہونا ہے۔ یہ چیز اگر کسی شخص کو حاصل نہ ہو تو وہ سب کچھ دیکھ کر بھی کچھ نہیں دیکھتا۔

ان دونوں آیتوں میں خطاب تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ہے مگر ملامت ان لوگوں کو کی جا رہی ہے جن کی اصلاح کے آپؐ درپے تھے۔ اور اس ملامت کی غرض بھی محض ملامت کرنا نہیں ہے بلکہ طنز کا تیر و نشتر اس لیے چبھویا جا رہا ہے کہ ان کی سوئی ہوئی انسانیت اس کی چبھن سے کچھ بیدار ہو اور ان کی چشم و گوش سے ان کے دل تک جانے والا راستہ کُھلے، تاکہ معقول بات اور دردمندانہ نصیحت وہاں تک پہنچ سکے۔ یہ اندازِ بیان کچھ اس طرح کا ہے جیسے کوئی نیک آدمی بگڑے ہوئے لوگوں کے درمیان بلند ترین اخلاقی سیرت کے ساتھ رہتا ہو اور نہایت اخلاص و دردمندی کے ساتھ اُن کو اُن کی اُس گری ہوئی حالت کا احساس دلا رہا ہو جس میں وہ پڑے ہوئے ہیں اور بڑی معقولیت و سنجیدگی کے ساتھ انھیں سمجھانے کی کوشش کر رہا ہو کہ ان کے طریقِ زندگی میں کیا خرابی ہے اور صحیح طریقِ زندگی کیا ہے۔ مگر کوئی نہ تو اس کی پاکیزہ زندگی سے سبق لیتا ہو نہ اس کی ان خیر خواہانہ نصیحتوں کی طرف توجہ کرتا ہو۔ اس حالت میں عین اُس وقت جب کہ وہ ان لوگوں کو سمجھانے میں مشغول ہو اور وہ اس کی باتوں کو سُنی اَن سُنی کیے جا رہے ہوں، اس کا کوئی دوست آ کر اس سے کہے کہ میاں! یہ تم کن بہروں کو سنا رہے ہو اور کن اندھوں کو راستہ دکھانا چاہتے ہو، ان کے تو دل کے کان بند ہیں اور ان کی ہیے کی آنکھیں پھوٹی ہوئی ہیں۔ یہ بات کہنے سے اُس دوست کا منشا یہ نہیں ہوگا کہ وہ مردِ صالح اپنی سعیِ اصلاح سے باز آ جائے۔ بلکہ دراصل اس کی غرض یہ ہوگی کہ شاید اس طنز اور ملامت ہی سے ان نیند کے ماتوں کو کچھ ہوش آ جائے۔

۵۲ – یعنی اللہ نے تو انھیں کان بھی دیے ہیں اور آنکھیں بھی اور دل بھی۔ اس نے اپنی طرف سے کوئی ایسی چیز ان کو دینے

وَ يَوۡمَ يَحۡشُرُهُمۡ كَاَنۡ لَّمۡ يَلۡبَثُوۡۤا اِلَّا سَاعَةً مِّنَ النَّهَارِ يَتَعَارَفُوۡنَ بَيۡنَهُمۡ ؕ قَدۡ خَسِرَ الَّذِيۡنَ كَذَّبُوۡا بِلِقَآءِ اللّٰهِ وَمَا كَانُوۡا مُهۡتَدِيۡنَ ﴿۴۵﴾ وَ اِمَّا نُرِيَنَّكَ بَعۡضَ الَّذِىۡ نَعِدُهُمۡ اَوۡ نَتَوَفَّيَنَّكَ فَاِلَيۡنَا مَرۡجِعُهُمۡ ثُمَّ اللّٰهُ شَهِيۡدٌ عَلٰى مَا يَفۡعَلُوۡنَ ﴿۴۶﴾ وَلِكُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوۡلٌ ۚ فَاِذَا جَآءَ رَسُوۡلُهُمۡ قُضِىَ بَيۡنَهُمۡ

مست ہیں) اور جس روز اللہ ان کو اکٹھا کرے گا تو (یہی دُنیا کی زندگی اِنھیں ایسی محسوس ہوگی) گویا یہ محض ایک گھڑی بھر آپس میں جان پہچان کرنے کو ٹھیرے تھے۔[۵۳] (اس وقت تحقیق ہو جائے گا کہ) فی الواقع سخت گھاٹے میں رہے وہ لوگ جنھوں نے اللہ کی ملاقات کو جھٹلایا[۵۴] اور ہرگز وہ راہِ راست پر نہ تھے۔ جن بُرے نتائج سے ہم انھیں ڈرا رہے ہیں، ان کا کوئی حصّہ ہم تیرے جیتے جی دکھا دیں یا اس سے پہلے ہی تجھے اُٹھا لیں، بہر حال اِنھیں آنا ہماری ہی طرف ہے اور جو کچھ یہ کر رہے ہیں اس پر اللہ گواہ ہے۔

ہر اُمّت کے لیے ایک رسول ہے۔[۵۵] پھر جب کسی اُمّت کے پاس اُس کا رسول آجاتا ہے تو اس کا فیصلہ

میں بُخل نہیں کیا ہے جو حق و باطل کا فرق دیکھنے اور سمجھنے کے لیے ضروری تھی۔ مگر لوگوں نے خواہشات کی بندگی اور دُنیا کے عشق میں مبتلا ہو کر آپ ہی اپنی آنکھیں پھوڑ لی ہیں، اپنے کان بہرے کر لیے ہیں اور اپنے دلوں کو اتنا مسخ کر لیا ہے کہ ان میں بھلے برے کی تمیز، صحیح و غلط کے فہم اور ضمیر کی زندگی کا کوئی اثر باقی نہ رہا۔

۵۳ – یعنی جب ایک طرف آخرت کی بے پایاں زندگی ان کے سامنے ہوگی اور دوسری طرف یہ پلٹ کر اپنی دُنیا کی زندگی پر نگاہ ڈالیں گے تو انھیں مستقبل کے مقابلے میں اپنا یہ ماضی نہایت حقیر محسوس ہوگا۔ اُس وقت اِن کو اندازہ ہوگا کہ انھوں نے اپنی سابقہ زندگی میں تھوڑی سی لذتوں اور منفعتوں کی خاطر اپنے اس اَبدی مستقبل کو خراب کر کے کتنی بڑی حماقت کا ارتکاب کیا ہے۔

۵۴ – یعنی اس بات کو کہ ایک دن اللہ کے سامنے حاضر ہونا ہے۔

۵۵ – ''اُمّت'' کا لفظ یہاں محض قوم کے معنی میں نہیں ہے، بلکہ ایک رسول کی آمد کے بعد اس کی دعوت جن جن لوگوں تک پہنچے وہ سب اس کی اُمّت ہیں۔ نیز اس کے لیے یہ بھی ضروری نہیں ہے کہ رسول ان کے درمیان زندہ موجود ہو، بلکہ رسول کے بعد بھی جب تک اس کی تعلیم موجود رہے اور ہر شخص کے لیے یہ معلوم کرنا ممکن ہو کہ وہ درحقیقت کس چیز کی تعلیم دیتا تھا، اس وقت تک دُنیا کے

بِالْقِسْطِ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ﴿۴۷﴾ وَيَقُوْلُوْنَ مَتٰى هٰذَا الْوَعْدُ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۴۸﴾ قُلْ لَّآ اَمْلِكُ لِنَفْسِيْ ضَرًّا وَّلَا نَفْعًا اِلَّا مَاشَآءَ اللّٰهُ ؕ لِكُلِّ اُمَّةٍ اَجَلٌ ؕ اِذَا جَآءَ اَجَلُهُمْ فَلَا يَسْتَاْخِرُوْنَ سَاعَةً وَّلَا يَسْتَقْدِمُوْنَ ﴿۴۹﴾ قُلْ اَرَءَيْتُمْ اِنْ اَتٰىكُمْ

پُورے انصاف کے ساتھ چُکا دیا جاتا ہے اور اس پر ذرّہ برابر ظلم نہیں کیا جاتا۔[۵۶]

کہتے ہیں: اگر تمھاری یہ دھمکی سچّی ہے تو آخر یہ کب پُوری ہوگی؟ کہو: "میرے اختیار میں خود اپنا نفع و ضرر بھی نہیں، سب کچھ اللہ کی مشیّت پر موقوف ہے۔[۵۷] ہر اُمّت کے لیے مُہلت کی ایک مدّت ہے، جب یہ مدّت پُوری ہو جاتی ہے تو گھڑی بھر کی تقدیم و تاخیر بھی نہیں ہوتی۔"[۵۸] اِن سے کہو: کبھی تم نے یہ بھی سوچا کہ اگر اللہ کا

سب لوگ اس کی اُمّت ہی قرار پائیں گے اور ان پر وہ حکم ثابت ہوگا جو آگے بیان کیا جا رہا ہے۔ اس لحاظ سے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری کے بعد تمام دنیا کے انسان آپؐ کی اُمّت ہیں اور اُس وقت تک رہیں گے جب تک قرآن اپنی خالص صورت میں شائع ہوتا رہے گا۔ اسی وجہ سے آیت میں یہ نہیں فرمایا گیا کہ "ہر قوم میں ایک رسول ہے" بلکہ ارشاد یہ ہُوا ہے کہ "ہر اُمّت کے لیے ایک رسول ہے"۔

۵۶ – مطلب یہ ہے کہ رسول کی دعوت کا کسی گروہِ انسانی تک پہنچنا گویا اُس گروہ پر اللہ کی حجت کا پورا ہو جانا ہے۔ اس کے بعد صرف فیصلہ ہی باقی رہ جاتا ہے، کسی مزید اِتمامِ حجت کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ اور یہ فیصلہ غایت درجہ انصاف کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ جو لوگ رسول کی بات مان لیں اور اپنا رَویّہ درست کر لیں، وہ اللہ کی رحمت کے مستحق قرار پاتے ہیں۔ اور جو اس کی بات نہ مانیں وہ عذاب کے مستحق ہو جاتے ہیں۔ خواہ وہ عذاب دُنیا اور آخرت دونوں میں دیا جائے یا صرف آخرت میں۔

۵۷ – یعنی میں نے یہ کب کہا تھا کہ یہ فیصلہ میں چُکاؤں گا اور نہ ماننے والوں کو میں عذاب دوں گا۔ اس لیے مجھ سے کیا پوچھتے ہو کہ فیصلہ چُکائے جانے کی دھمکی کب پوری ہوگی۔ دھمکی تو اللہ نے دی ہے، وہی فیصلہ چُکائے گا اور اسی کے اختیار میں ہے کہ فیصلہ کب کرے اور کس صورت میں اُس کو تمھارے سامنے لائے۔

۵۸ – مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ جلد باز نہیں ہے۔ اس کا یہ طریقہ نہیں ہے کہ جس وقت رسول کی دعوت کسی شخص یا گروہ کو پہنچی، اُسی وقت جو ایمان لے آیا بس وہ تو رحمت کا مستحق قرار پایا اور جس کسی نے اس کو ماننے سے انکار کیا یا ماننے میں تامّل کیا اُس پر فوراً عذاب کا فیصلہ نافذ کر دیا گیا۔ نہیں، اللہ کا قاعدہ یہ ہے کہ اپنا پیغام پہنچانے کے بعد وہ ہر فرد کو اس کی انفرادی حیثیت کے مطابق، اور ہر گروہ اور قوم کو اس کی اجتماعی حیثیت کے مطابق، سوچنے سمجھنے اور سنبھلنے کے لیے کافی وقت دیتا ہے۔ یہ مہلت کا زمانہ

عَذَابُهٗ بَيَاتًا اَوْ نَهَارًا مَّاذَا يَسْتَعْجِلُ مِنْهُ الْمُجْرِمُوْنَ ﴿۵۰﴾ اَثُمَّ اِذَا مَا وَقَعَ اٰمَنْتُمْ بِهٖ ؕ آٰلْـٰٔنَ وَقَدْ كُنْتُمْ بِهٖ تَسْتَعْجِلُوْنَ ﴿۵۱﴾ ثُمَّ قِيْلَ لِلَّذِيْنَ ظَلَمُوْا ذُوْقُوْا عَذَابَ الْخُلْدِ ۚ هَلْ تُجْزَوْنَ اِلَّا بِمَا كُنْتُمْ تَكْسِبُوْنَ ﴿۵۲﴾ وَيَسْتَنْۢبِـُٔوْنَكَ اَحَقٌّ هُوَ ؕ قُلْ اِيْ وَرَبِّيْٓ اِنَّهٗ لَحَقٌّ ؕۚ وَمَآ اَنْتُمْ بِمُعْجِزِيْنَ ﴿۵۳﴾ ع وَلَوْ اَنَّ لِكُلِّ نَفْسٍ ظَلَمَتْ مَا فِي الْاَرْضِ لَافْتَدَتْ بِهٖ ؕ وَاَسَرُّوا النَّدَامَةَ لَمَّا

وقف النبی علیہ السلام ۔ ع ۱۰/۵ ۔ وقف النبی علیہ السلام

عذاب اچانک رات کو یا دن کو آ جائے (تو تم کیا کر سکتے ہو؟)۔ آخر یہ ایسی کون سی چیز ہے جس کے لیے مجرم جلدی مچائیں؟ کیا جب وہ تم پر آ پڑے اسی وقت تم اسے مانو گے؟ ــــ اب بچنا چاہتے ہو؟ حالانکہ تم خود ہی اس کے جلدی آنے کا تقاضا کر رہے تھے! پھر ظالموں سے کہا جائے گا کہ اب ہمیشہ کے عذاب کا مزا چکھو، جو کچھ تم کماتے رہے ہو، اس کی پاداش کے سوا اور کیا بدلہ تم کو دیا جا سکتا ہے؟

پھر پُوچھتے ہیں: کیا واقعی یہ سچ ہے جو تم کہہ رہے ہو؟ کہو: "میرے رب کی قسم! یہ بالکل سچ ہے اور تم اتنا بل بُوتا نہیں رکھتے کہ اسے ظُہور میں آنے سے روک دو۔" ع اگر ہر اُس شخص کے پاس جس نے ظلم کیا ہے، رُوئے زمین کی دولت بھی ہو تو اُس عذاب سے بچنے کے لیے وہ اسے فدیے میں دینے پر آمادہ ہو جائے گا۔ جب یہ لوگ اس عذاب کو دیکھ لیں گے تو دل ہی دل میں پچھتائیں[۵۹] گے۔

بسا اوقات صدیوں تک دراز ہوتا ہے اور اس بات کو اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ کس کو کتنی مُہلت ملنی چاہیے۔ پھر جب وہ مُہلت، جو سراسر انصاف کے ساتھ اس کے لیے رکھی گئی تھی، پوری ہو جاتی ہے اور وہ شخص یا گروہ اپنی باغیانہ رَوِش سے باز نہیں آتا، تب اللہ تعالیٰ اس پر اپنا فیصلہ نافذ کرتا ہے۔ یہ فیصلے کا وقت اللہ کی مقرر کی ہوئی مدّت سے نہ ایک گھڑی پہلے آ سکتا ہے اور نہ وقت آ جانے کے بعد ایک لمحے کے لیے ٹل سکتا ہے۔

۵۹ – جس چیز کو عمر بھر جھٹلاتے رہے، جسے جھوٹ سمجھ کر ساری زندگی غلط کاموں میں کھپا گئے، اور جس کی خبر دینے

رَاَوُا الْعَذَابَ ۚ وَقُضِيَ بَيْنَهُمْ بِالْقِسْطِ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ﴿۵۴﴾ اَلَآ اِنَّ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۗ اَلَآ اِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ وَّلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۵۵﴾ هُوَ يُحْيٖ وَيُمِيْتُ وَاِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ﴿۵۶﴾ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَتْكُمْ مَّوْعِظَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَشِفَآءٌ لِّمَا فِي الصُّدُوْرِ ۙ وَهُدًى وَّرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۵۷﴾ قُلْ بِفَضْلِ اللّٰهِ وَبِرَحْمَتِهٖ فَبِذٰلِكَ فَلْيَفْرَحُوْا ۗ هُوَ خَيْرٌ مِّمَّا يَجْمَعُوْنَ ﴿۵۸﴾ قُلْ اَرَءَيْتُمْ مَّآ اَنْزَلَ اللّٰهُ لَكُمْ مِّنْ رِّزْقٍ

مگر ان کے درمیان پُورے انصاف سے فیصلہ کیا جائے گا، کوئی ظلم ان پر نہ ہو گا۔ سنو! آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے اللہ کا ہے۔ سُن رکھو! اللہ کا وعدہ سچا ہے مگر اکثر انسان جانتے نہیں ہیں۔ وہی زندگی بخشتا ہے اور وہی موت دیتا ہے اور اسی کی طرف تم سب کو پلٹنا ہے۔

لوگو! تمھارے پاس تمھارے رب کی طرف سے نصیحت آ گئی ہے۔ یہ وہ چیز ہے جو دلوں کے امراض کی شفا ہے اور جو اسے قبول کرلیں ان کے لیے رہنمائی اور رحمت ہے۔ اے نبیؐ! کہو کہ ”یہ اللہ کا فضل اور اس کی مہربانی ہے کہ یہ چیز اس نے بھیجی، اس پر تو لوگوں کو خوشی منانی چاہیے، یہ اُن سب چیزوں سے بہتر ہے جنھیں لوگ سمیٹ رہے ہیں۔“ اے نبیؐ! ان سے کہو: ”تم لوگوں نے کبھی یہ بھی سوچا ہے کہ جو رزق[۶۰] اللہ نے تمھارے لیے اُتارا تھا

والے پیغمبروں کو طرح طرح کے الزام دیتے رہے، وہی چیز جب ان کی توقّعات کے بالکل خلاف اچانک سامنے آ کھڑی ہوگی تو ان کے پاؤں تلے سے زمین نکل جائے گی۔ ان کا ضمیر انھیں خود بتا دے گا کہ جب حقیقت یہ تھی تو جو کچھ وہ دُنیا میں کر کے آئے ہیں اُس کا انجام اب کیا ہونا ہے۔ خود کردہ را علاجے نیست۔ زبانیں بند ہوں گی اور ندامت وحسرت سے دل اندر ہی اندر بیٹھے جا رہے ہوں گے۔ جس شخص نے قیاس وگمان کے سودے پر اپنی ساری پونجی لگا دی ہو اور کسی خیر خواہ کی بات مان کر نہ دی ہو، وہ دیوالہ نکلنے کے بعد خود اپنے سوا اور کس کی شکایت کر سکتا ہے۔

فَجَعَلْتُمْ مِّنْهُ حَرَامًا وَّ حَلٰلًا ؕ قُلْ آٰللّٰهُ اَذِنَ لَكُمْ

اس میں سے تم نے خود ہی کسی کو حرام اور کسی کو حلال ٹھیرا لیا![61] ''اِن سے پوچھو: اللہ نے تم کو اس کی اجازت دی تھی؟

۶۰ – اُردو زبان میں رزق کا اطلاق صرف کھانے پینے کی چیزوں پر ہوتا ہے۔ اسی وجہ سے لوگ خیال کرتے ہیں کہ یہاں گرفت صرف اُس قانون سازی پر کی گئی ہے جو دسترخوان کی چھوٹی سی دُنیا میں مذہبی اَوہام یا رسم و رواج کی بنا پر لوگوں نے کر ڈالی ہے۔ اس غلط فہمی میں جُہلا اور عوام ہی نہیں، علما تک مبتلا ہیں۔ حالانکہ عربی زبان میں رزق محض خوراک کے معنیٰ تک محدود نہیں ہے، بلکہ عطا اور بخشش اور نصیب کے معنیٰ میں عام ہے۔ اللہ تعالیٰ نے جو کچھ بھی دنیا میں انسان کو دیا ہے، وہ سب اس کا رزق ہے، حتیٰ کہ اولاد تک رزق ہے۔ اسماءُ الرّجال کی کتابوں میں بکثرت راویوں کے نام رزق اور رُزَیق اور رزق اللہ ملتے ہیں، جس کے معنیٰ تقریباً وہی ہیں جو اُردو میں ''اللہ دیے'' کے معنیٰ ہیں۔ مشہور دُعا ہے: اللھم ارنا الحق حقا وارزقنا اتباعہ، یعنی ہم پر حق واضح کر اور ہمیں اس کے اتباع کی توفیق دے۔ محاورے میں بولا جاتا ہے: رُزِقَ علمًا، فلاں شخص کو علم دیا گیا ہے۔ حدیث میں ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر حاملہ کے پیٹ میں ایک فرشتہ بھیجتا ہے اور وہ پیدا ہونے والے کا رزق اور اس کی مدّتِ عمر اور اس کا کام لکھ دیتا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہاں رزق سے مراد صرف وہ خوراک ہی نہیں ہے جو اس بچے کو آیندہ ملنے والی ہے بلکہ وہ سب کچھ ہے جو اُسے دُنیا میں دیا جائے گا۔ خود قرآن میں ہے: مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ، جو کچھ ہم نے ان کو دیا ہے، اس میں سے خرچ کرتے ہیں۔ پس رزق کو محض دسترخوان کی سرحدوں تک محدود سمجھنا اور یہ خیال کرنا کہ اللہ تعالیٰ کو صرف اُن پابندیوں اور آزادیوں پر اعتراض ہے جو کھانے پینے کی چیزوں کے معاملے میں لوگوں نے بطورِ خود اختیار کر لی ہیں، سخت غلطی ہے۔ اور یہ کوئی معمولی غلطی نہیں ہے۔ اس کی بدولت خدا کے دین کی ایک بہت بڑی اُصولی تعلیم لوگوں کی نگاہوں سے اوجھل ہو گئی ہے۔ یہ اسی غلطی کا تو نتیجہ ہے کہ کھانے پینے کی چیزوں میں حِلّت وحُرمت اور جواز وعَدَمِ جواز کا معاملہ تو ایک دینی معاملہ سمجھا جاتا ہے، لیکن تمدّن کے وسیع تر معاملات میں اگر یہ اُصول طے کر لیا جائے کہ انسان خود اپنے لیے حدود مقرر کرنے کا حق رکھتا ہے، اور اسی بنا پر خدا اور اس کی کتاب سے بے نیاز ہو کر قانون سازی کی جانے لگے، تو عامی تو درکنار، علمائے دین ومفتیانِ شرعِ متین اور مفسرینِ قرآن وشیوخِ حدیث تک کو یہ احساس نہیں ہوتا کہ یہ چیز بھی دین سے اسی طرح ٹکراتی ہے جس طرح ماکولات ومشروبات میں شریعتِ الٰہی سے بے نیاز ہو کر جائز وناجائز کے حُدود بطورِ خود مقرر کر لینا۔

۶۱ – یعنی تمھیں کچھ احساس بھی ہے کہ یہ کتنا سخت باغیانہ جُرم ہے جو تم کر رہے ہو۔ رزق اللہ کا ہے اور تم خود اللہ کے ہو، پھر یہ حق آخر تمھیں کہاں سے حاصل ہو گیا کہ اللہ کی املاک میں اپنے تصرُّف، استعمال اور انتفاع کے لیے خود حد بندیاں مقرر کرو؟ کوئی نوکر اگر یہ دعویٰ کرے کہ آقا کے مال میں اپنے تصرُّف اور اختیارات کی حدیں اسے خود مقرر کر لینے کا حق ہے اور اِس معاملے میں آقا کے کچھ بولنے کی سرے سے کوئی ضرورت ہی نہیں ہے، تو اس کے متعلق تمھاری کیا رائے ہے؟ تمھارا اپنا ملازم اگر تمھارے گھر میں اور تمھارے گھر کی سب چیزوں میں اپنے عمل اور استعمال کے لیے اس آزادی وخود مختاری کا دعویٰ کرے تو تم اس کے ساتھ کیا معاملہ کرو گے؟ — اُس نوکر کا معاملہ تو دوسرا ہی ہے جو سرے سے یہی نہیں مانتا کہ وہ کسی کا نوکر ہے اور کوئی اس کا آقا بھی ہے اور یہ

اَمْ عَلَى اللّٰهِ تَفْتَرُوْنَ ﴿۵۹﴾ وَمَا ظَنُّ الَّذِيْنَ يَفْتَرُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَذُوْ فَضْلٍ عَلَى النَّاسِ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَشْكُرُوْنَ ﴿۶۰﴾ؑ وَمَا تَكُوْنُ فِيْ شَاْنٍ وَّمَا تَتْلُوْا مِنْهُ مِنْ قُرْاٰنٍ وَّ

یا تم اللہ پر افترا کر رہے ہو؟[۶۲] جو لوگ اللہ پر یہ جھوٹا افترا باندھتے ہیں، ان کا کیا گمان ہے کہ قیامت کے روز ان سے کیا معاملہ ہوگا؟ اللہ تو لوگوں پر مہربانی کی نظر رکھتا ہے مگر اکثر انسان ایسے ہیں جو شُکر نہیں کرتے۔[۶۳] ع

اَے نبیؐ! تم جس حال میں بھی ہوتے ہو اور قرآن میں سے جو کچھ بھی سُناتے ہو، اور لوگو!

کسی اور کا مال ہے جو اس کے تصرُّف میں ہے۔ اُس بدمعاش غاصب کی پوزیشن یہاں زیرِ بحث نہیں ہے۔ یہاں سوال اُس نوکر کی پوزیشن کا ہے جو خود مان رہا ہے کہ وہ کسی کا نوکر ہے اور یہ بھی مانتا ہے کہ مال اُسی کا ہے جس کا وہ نوکر ہے، اور پھر کہتا ہے کہ اس مال میں اپنے تصرُّف کے حُدود مقرر کر لینے کا حق مجھے آپ ہی حاصل ہے اور آقا سے کچھ پوچھنے کی ضرورت نہیں ہے۔

۶۲ – یعنی تمھاری یہ پوزیشن صرف اسی صورت میں صحیح ہو سکتی تھی کہ آقا نے خود تم کو مجاز کر دیا ہوتا کہ میرے مال میں تم جس طرح چاہو تصرُّف کرو، اپنے عمل اور استعمال کے حدود، قوانین، ضوابط سب کچھ بنا لینے کے جملہ حقوق میں نے تمھیں سونپے۔ اب سوال یہ ہے کہ کیا تمھارے پاس واقعی اس کی کوئی سند ہے کہ آقا نے تم کو یہ اختیارات دے دیے ہیں؟ یا تم بغیر کسی سند کے یہ دعویٰ کر رہے ہو کہ وہ تمام حُقوق تمھیں سونپ چکا ہے؟ اگر پہلی صورت ہے تو براہِ کرم وہ سند دکھاؤ، ورنہ بصورتِ دیگر یہ کُھلی بات ہے کہ تم بغاوت پر جھوٹ اور افترا پردازی کا مزید جرم کر رہے ہو۔

۶۳ – یعنی یہ تو آقا کی کمال درجے مہربانی ہے کہ وہ نوکر کو خود بتاتا ہے کہ میرے گھر میں اور میرے مال میں اور خود اپنے نفس میں تُو کون سا طرزِ عمل اختیار کرے گا تو میری خوشنودی اور انعام اور ترقی سے سرفراز ہوگا، اور کس طریقِ کار سے میرے غضب اور سزا اور تنزُّل کا مُستوجِب ہوگا۔ مگر بہت سے بے وقوف نوکر ایسے ہیں جو اس عنایت کا شکریہ ادا نہیں کرتے۔ گویا ان کے نزدیک ہونا یہ چاہیے تھا کہ آقا ان کو بس اپنے گھر میں لا کر چھوڑ دیتا اور سب مال ان کے اختیار میں دے دینے کے بعد چُھپ کر دیکھتا رہتا کہ کون سا نوکر کیا کرتا ہے، پھر جو بھی اس کی مرضی کے خلاف ـــــ جس کا کسی نوکر کو علم نہیں ـــــ کوئی کام کرتا تو اُسے وہ سزا دے ڈالتا۔ حالانکہ اگر آقا نے اپنے نوکروں کو اتنے سخت امتحان میں ڈالا ہوتا تو ان میں سے کسی کا بھی سزا سے بچ جانا ممکن نہ تھا۔

لَا تَعْمَلُوْنَ مِنْ عَمَلٍ اِلَّا كُنَّا عَلَيْكُمْ شُهُوْدًا اِذْ تُفِيْضُوْنَ فِيْهِ ؕ وَمَا يَعْزُبُ عَنْ رَّبِّكَ مِنْ مِّثْقَالِ ذَرَّةٍ فِي الْاَرْضِ وَلَا فِي السَّمَآءِ وَلَآ اَصْغَرَ مِنْ ذٰلِكَ وَلَآ اَكْبَرَ اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ ﴿۶۱﴾ اَلَآ اِنَّ اَوْلِيَآءَ اللّٰهِ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿۶۲﴾ اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَكَانُوْا يَتَّقُوْنَ ﴿۶۳﴾ لَهُمُ الْبُشْرٰى فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَفِي الْاٰخِرَةِ ؕ لَا تَبْدِيْلَ لِكَلِمٰتِ اللّٰهِ ؕ ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ﴿۶۴﴾ وَلَا يَحْزُنْكَ قَوْلُهُمْ ۘ اِنَّ الْعِزَّةَ لِلّٰهِ جَمِيْعًا ؕ هُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ﴿۶۵﴾

وقف لازم

تم بھی جو کچھ کرتے ہو، اُس سب کے دَوران میں ہم تم کو دیکھتے رہتے ہیں۔ کوئی ذرہ برابر چیز آسمان اور زمین میں ایسی نہیں ہے، نہ چھوٹی نہ بڑی، جو تیرے رب کی نظر سے پوشیدہ ہو اور ایک صاف دفتر میں درج نہ ہو۔[۶۴] سُنو! جو اللہ کے دوست ہیں، جو ایمان لائے اور جنھوں نے تقویٰ کا رویّہ اختیار کیا، ان کے لیے کسی خوف اور رنج کا موقع نہیں ہے۔ دُنیا اور آخرت دونوں زندگیوں میں ان کے لیے بشارت ہی بشارت ہے۔ اللہ کی باتیں بدل نہیں سکتیں۔ یہی بڑی کامیابی ہے۔ اے نبیؐ! جو باتیں یہ لوگ تجھ پر بناتے ہیں وہ تجھے رنجیدہ نہ کریں، عزت ساری کی ساری خدا کے اختیار میں ہے، اور وہ سب کچھ سنتا اور جانتا ہے۔

۶۴ – یہاں اس بات کا ذکر کرنے سے مقصود نبیؐ کو تسکین دینا اور نبی کے مخالفین کو متنبّہ کرنا ہے۔ ایک طرف نبی سے ارشاد ہو رہا ہے کہ پیغامِ حق کی تبلیغ اور خلق اللہ کی اصلاح میں جس تن دہی و جاں فشانی اور جس صبر و تحمل سے تم کام کر رہے ہو، وہ ہماری نظر میں ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ اس پُر خطر کام پر مامور کر کے ہم نے تم کو تمھارے حال پر چھوڑ دیا ہو۔ جو کچھ تم کر رہے ہو وہ بھی ہم دیکھ رہے ہیں اور جو کچھ تمھارے ساتھ ہو رہا ہے اس سے بھی ہم بے خبر نہیں ہیں۔ دوسری طرف نبی کے مخالفین کو آگاہ کیا جا رہا ہے کہ ایک داعیِ حق اور خیر خواہِ خلق کی اصلاحی کوششوں میں روڑے اٹکا کر تم کہیں یہ نہ سمجھ لینا کہ کوئی تمھاری ان حرکتوں کو دیکھنے والا نہیں ہے اور کبھی تمھارے ان کرتوتوں کی باز پُرس نہ ہوگی۔ خبردار رہو! وہ سب کچھ جو تم کر رہے ہو، خدا کے دفتر میں ثبت ہو رہا ہے۔

أَلَآ إِنَّ لِلَّهِ مَن فِي ٱلسَّمَٰوَٰتِ وَمَن فِي ٱلْأَرْضِ ۗ وَمَا يَتَّبِعُ ٱلَّذِينَ يَدْعُونَ مِن دُونِ ٱللَّهِ شُرَكَآءَ ۚ إِن يَتَّبِعُونَ إِلَّا ٱلظَّنَّ وَإِنْ هُمْ إِلَّا يَخْرُصُونَ ﴿٦٦﴾ هُوَ ٱلَّذِي جَعَلَ لَكُمُ ٱلَّيْلَ لِتَسْكُنُوا۟ فِيهِ وَٱلنَّهَارَ مُبْصِرًا ۚ إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَءَايَٰتٍ لِّقَوْمٍ يَسْمَعُونَ ﴿٦٧﴾

آگاہ رہو! آسمان کے بسنے والے ہوں یا زمین کے، سب کے سب اللہ کے مملوک ہیں۔ اور جو لوگ اللہ کے سوا کچھ (اپنے خودساختہ) شریکوں کو پکار رہے ہیں، وہ نرے وہم و گمان کے پیرو ہیں اور محض قیاس آرائیاں کرتے ہیں۔ وہ اللہ ہی ہے جس نے تمھارے لیے رات بنائی کہ اس میں سُکون حاصل کرو اور دن کو روشن بنایا۔ اس میں نشانیاں ہیں اُن لوگوں کے لیے جو (کُھلے کانوں سے پیغمبر کی دعوت کو) سُنتے ہیں۔[65]

۶۵ — یہ ایک تشریح طلب مضمون ہے جسے بہت مختصر لفظوں میں بیان کیا گیا ہے۔ فلسفیانہ تجسُّس، جس کا مقصد یہ پتا چلانا ہے کہ اس کائنات میں بظاہر جو کچھ ہم دیکھتے اور محسوس کرتے ہیں، اس کے پیچھے کوئی حقیقت پوشیدہ ہے یا نہیں، اور ہے تو وہ کیا ہے، دنیا میں اُن سب لوگوں کے لیے جو وحی والہام سے براہِ راست حقیقت کا علم نہیں پاتے، مذہب کے متعلّق رائے قائم کرنے کا واحد ذریعہ ہے۔ کوئی شخص بھی، خواہ وہ دہریّت اختیار کرے یا شرک یا خدا پرستی، بہر حال ایک نہ ایک طرح کا فلسفیانہ تجسُّس کیے بغیر مذہب کے بارے میں کسی نتیجے پر نہیں پہنچ سکتا۔ اور پیغمبروں نے جو مذہب پیش کیا ہے، اس کی جانچ بھی اگر ہو سکتی ہے تو اسی طرح ہو سکتی ہے کہ آدمی، اپنی بِساط بھر، فلسفیانہ غور و فکر کر کے اطمینان حاصل کرنے کی کوشش کرے کہ پیغمبر ہمیں مظاہرِ کائنات کے پیچھے جس حقیقت کے مستور ہونے کا پتا دے رہے ہیں وہ دل کو لگتی ہے یا نہیں۔ اس تجسُّس کے صحیح یا غلط ہونے کا تمام تر انحصار طریقِ تجسُّس پر ہے۔ اس کے غلط ہونے سے غلط رائے اور صحیح ہونے سے صحیح رائے قائم ہوتی ہے۔ اب ذرا جائزہ لے کر دیکھیے کہ دنیا میں مختلف گروہوں نے اس تجسُّس کے لیے کون کون سے طریقے اختیار کیے ہیں؟

مشرکین نے خالص وہم پر اپنی تلاش کی بنیاد رکھی ہے۔

اِشراقیوں اور جوگیوں نے اگرچہ مراقبے کا ڈھونگ رچایا ہے اور دعویٰ کیا ہے کہ ہم ظاہر کے پیچھے جھانک کر باطن کا مشاہدہ کر لیتے ہیں لیکن فی الواقع انھوں نے اپنی اس سراغ رسانی کی بِنا گمان پر رکھی ہے۔ وہ مراقبہ دراصل اپنے گمان کا کرتے ہیں، اور جو کچھ وہ کہتے ہیں کہ ہمیں نظر آتا ہے، اُس کی حقیقت اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ گمان سے جو خیال انھوں نے قائم کر لیا ہے اسی پر

تخیُّل کو جما دینے اور پھر اس پر ذہن کا دباؤ ڈالنے سے ان کو وہی خیال چلتا پھرتا نظر آنے لگتا ہے۔

اصطلاحی فلسفیوں نے قیاس کو بنائے تحقیق بنایا ہے جو اصل میں تو گمان ہی ہے لیکن اس گمان کے لنگڑے پن کو محسوس کر کے انھوں نے مَنطِقی اِستدلال اور مصنوعی تَعَقّل کی بیساکھیوں پر اسے چلانے کی کوشش کی ہے اور اس کا نام "قیاس" رکھ دیا ہے۔

سائنس دانوں نے اگرچہ سائنس کے دائرے میں تحقیقات کے لیے علمی طریقہ اختیار کیا، مگر مابعد الطبیعیات کے حُدود میں قدم رکھتے ہی وہ بھی علمی طریقے کو چھوڑ کر قیاس وگمان اور اندازے اور تخمینے کے پیچھے چل پڑے۔

پھر ان سب گروہوں کے اوہام اور گمانوں کو کسی نہ کسی طرح تعصُّب کی بیماری بھی لگ گئی، جس نے انھیں ایک دوسرے کی بات نہ سننے اور اپنی ہی محبُوب راہ پر مُڑنے، اور مُڑ جانے کے بعد مڑے رہنے پر مجبُور کر دیا۔

قرآن اس طریقِ تجسُّس کو بنیادی طور پر غلط قرار دیتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ تم لوگوں کی گمراہی کا اصل سبب یہی ہے کہ تم تلاشِ حقیقت کی بنا گمان اور قیاس آرائی پر رکھتے ہو اور پھر تعصُّب کی وجہ سے کسی کی معقول بات سننے کے لیے بھی آمادہ نہیں ہوتے۔ اسی دُہری غَلَطی کا نتیجہ یہ ہے کہ تمھارے لیے خود حقیقت کو پالینا تو ناممکن تھا ہی، انبیاؑ کے پیش کردہ دین کو جانچ کر صحیح رائے پر پہنچنا بھی غیر ممکن ہو گیا۔

اس کے مقابلے میں قرآن نے فلسفیانہ تحقیق کے لیے صحیح علمی وعقلی طریقہ یہ بتایا ہے کہ پہلے تم حقیقت کے متعلق اُن لوگوں کا بیان کُھلے کانوں سے، بلاتعصُّب سنو جو دعویٰ کرتے ہیں کہ ہم قیاس وگمان یا مراقبہ واِستِدراج کی بنا پر نہیں بلکہ "علم" کی بنا پر تمھیں بتا رہے ہیں کہ حقیقت یہ ہے۔ پھر کائنات میں جو آثار (باصطلاحِ قرآن "نشانات") تمھارے مشاہدے اور تجرِبے میں آتے ہیں ان پر غور کرو، ان کی شہادتوں کو مرتّب کر کے دیکھو، اور تلاش کرتے چلے جاؤ کہ اس ظاہر کے پیچھے جس حقیقت کی نشان دہی یہ لوگ کر رہے ہیں اُس کی طرف اشارہ کرنے والی علامات تم کو اسی ظاہر میں ملتی ہیں یا نہیں۔ اگر ایسی علامات نظر آئیں اور ان کے اشارے بھی واضح ہوں تو پھر کوئی وجہ نہیں کہ تم خواہ مخواہ اُن لوگوں کو جھٹلاؤ جن کا بیان آثار کی شہادتوں کے مطابق پایا جا رہا ہے — یہی طریقہ فلسفۂ اسلام کی بنیاد ہے جسے چھوڑ کر افسوس ہے کہ مسلمان فلاسفہ بھی افلاطون وارسطو کے نقشِ قدم پر چل پڑے۔

قرآن میں جگہ جگہ نہ صرف اِس طریق کی تلقین کی گئی ہے، بلکہ خود آثارِ کائنات کو پیش کر کر کے ان سے نتیجہ نکالنے اور حقیقت تک رسائی حاصل کرنے کی گویا باقاعدہ تربیت دی گئی ہے، تاکہ سوچنے اور تلاش کرنے کا یہ ڈھنگ ذہنوں میں راسخ ہو جائے۔ چنانچہ اس آیت میں بھی مثال کے طور پر صرف دو آثار کی طرف توجہ دلائی گئی ہے، یعنی رات اور دن۔ یہ انقلابِ لَیل ونہار دراصل سورج اور زمین کی نسبتوں میں انتہائی باضابطہ تغیُّر کی وجہ سے رُونما ہوتا ہے۔ یہ ایک عالَم گیر ناظم اور ساری کائنات پر غالب اقتدار رکھنے والے حاکم کے وجود کی صریح علامت ہے۔ اس میں صریح حکمت اور مقصدیت بھی نظر آتی ہے، کیونکہ تمام موجوداتِ زمین کی بے شمار مَصلَحتیں اسی گردشِ لیل ونہار کے ساتھ وابستہ ہیں۔ اس میں صریح رُبوبیّت اور رحمت اور پروردگاری کی علامتیں بھی پائی جاتی ہیں، کیونکہ اس سے یہ ثبوت ملتا ہے کہ جس نے زمین پر یہ موجودات پیدا کی ہیں، وہ خود ہی ان کے وجود کی ضروریات بھی فراہم کرتا ہے۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ وہ عالَم گیر ناظم ایک ہے، اور یہ بھی کہ وہ کھلنڈرا نہیں بلکہ حکیم ہے اور بامقصد کام کرتا ہے، اور یہ بھی کہ وہی محسن ومُربّی ہونے کی حیثیت سے عبادت کا مستحق ہے، اور یہ بھی کہ گردشِ لیل ونہار کے تحت جو کوئی بھی ہے وہ رب نہیں مَربُوب ہے،

قَالُوا اتَّخَذَ اللّٰهُ وَلَدًا سُبْحٰنَهٗ ؕ هُوَ الْغَنِيُّ ؕ لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ؕ اِنْ عِنْدَكُمْ مِّنْ سُلْطٰنٍۭ بِهٰذَا ؕ اَتَقُوْلُوْنَ

لوگوں نے کہہ دیا کہ اللہ نے کسی کو بیٹا بنایا ہے[۶۶] سُبحان اللہ[۶۷]! وہ تو بے نیاز ہے، آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے سب اس کی مِلک ہے[۶۸]۔ تمھارے پاس اس قول کے لیے آخر دلیل کیا ہے؟ کیا تم اللہ کے متعلق

آقا نہیں غلام ہے۔ اِن آثاری شہادتوں کے مقابلے میں مشرکین نے گمان و قیاس سے جو مذہب ایجاد کیے ہیں وہ آخر کس طرح صحیح ہو سکتے ہیں۔

۶۶ – اُوپر کی آیات میں لوگوں کی اس جاہلیّت پر ٹوکا گیا تھا کہ اپنے مذہب کی بِنا علم کے بجائے قیاس و گمان پر رکھتے ہیں اور پھر کسی علمی طریقے سے یہ تحقیق کرنے کی بھی کوشش نہیں کرتے کہ ہم جس مذہب پر چلے جا رہے ہیں اس کی کوئی دلیل بھی ہے یا نہیں۔ اب اسی سلسلے میں عیسائیوں اور بعض دوسرے اہلِ مذاہب کی اس نادانی پر ٹوکا گیا ہے کہ انھوں نے محض گمان سے کسی کو خدا کا بیٹا ٹھیرا لیا۔

۶۷– سبحان اللہ کلمۂ تعجب کے طور پر کبھی اظہارِ حیرت کے لیے بھی بولا جاتا ہے، اور کبھی اس کے واقعی معنیٰ ہی مراد ہوتے ہیں، یعنی یہ کہ "اللہ تعالیٰ ہر عیب سے مُنزّہ ہے"۔ یہاں یہ کلمہ دونوں معنیٰ دے رہا ہے۔ لوگوں کے اِس قول پر اظہارِ حیرت بھی مقصود ہے اور ان کی بات کے جواب میں یہ کہنا بھی مقصود ہے کہ اللہ تو بے عیب ہے، اس کی طرف بیٹے کی نسبت کس طرح صحیح ہو سکتی ہے۔

۶۸ – یہاں ان کے اس قول کی تردید میں تین باتیں کہی گئی ہیں: ایک یہ کہ اللہ بے عیب ہے۔ دوسرے یہ کہ وہ بے نیاز ہے۔ تیسرے یہ کہ آسمان و زمین کی ساری موجودات اُس کی مِلک ہیں۔ یہ مختصر جوابات تھوڑی سی تشریح سے بآسانی سمجھ میں آ سکتے ہیں:

ظاہر بات ہے کہ بیٹا یا تو صُلبی ہو سکتا ہے یا مُتبنّٰی۔ اگر یہ لوگ کسی کو خدا کا بیٹا صُلبی معنوں میں قرار دیتے ہیں تو اس کے معنیٰ یہ ہیں کہ خدا کو اُس حیوان پر قیاس کرتے ہیں جو شخصی حیثیت سے فانی ہوتا ہے اور جس کے وجود کا تسلسل بغیر اس کے قائم نہیں رہ سکتا کہ اس کی کوئی جنس ہو اور اس جنس سے کوئی اس کا جوڑا ہو اور ان دونوں کے صِنفی تعلّق سے اس کی اولاد ہو، جس کے ذریعے سے اس کا نوعی وجود اور اس کا کام باقی رہے۔ اور اگر یہ لوگ اس معنیٰ میں خدا کا بیٹا قرار دیتے ہیں کہ اس نے کسی کو مُتبنّٰی بنایا ہے، تو یہ دو حال سے خالی نہیں: یا تو انھوں نے خدا کو اُس انسان پر قیاس کیا ہے جو لاوَلد ہونے کی وجہ سے اپنی جنس کے کسی فرد کو اس لیے بیٹا بناتا ہے کہ وہ اس کا وارث ہو اور اُس نقصان کی، جو اسے بے اولاد رہ جانے کی وجہ سے پہنچ رہا ہے، برائے نام ہی سہی، کچھ تو تلافی کر دے۔ یا پھر ان کا گمان یہ ہے کہ خدا بھی انسان کی طرح جذباتی میلانات رکھتا ہے اور اپنے بے شمار بندوں میں سے کسی ایک کے ساتھ اس کو کچھ ایسی محبّت ہو گئی ہے کہ اس نے اسے بیٹا بنا لیا ہے۔

ان تینوں صورتوں میں سے جو صورت بھی ہو، بہر حال اس عقیدے کے بنیادی تصوّرات میں خدا پر بہت سے عُیوب، بہت

عَلَى اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۶۸﴾ قُلْ اِنَّ الَّذِيْنَ يَفْتَرُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ لَا يُفْلِحُوْنَ ﴿۶۹﴾ مَتَاعٌ فِي الدُّنْيَا ثُمَّ اِلَيْنَا مَرْجِعُهُمْ ثُمَّ نُذِيْقُهُمُ الْعَذَابَ الشَّدِيْدَ بِمَا كَانُوْا يَكْفُرُوْنَ ﴿۷۰﴾ وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَاَ نُوْحٍ ۘ اِذْ قَالَ لِقَوْمِهٖ يٰقَوْمِ اِنْ كَانَ كَبُرَ عَلَيْكُمْ مَّقَامِيْ وَتَذْكِيْرِيْ

ع ۷/۱۲ وقف لازم

وہ باتیں کہتے ہو جو تمھارے علم میں نہیں ہیں؟ اے محمدؐ! کہہ دو کہ جو لوگ اللہ پر جھوٹے افترا باندھتے ہیں، وہ ہرگز فلاح نہیں پا سکتے۔ دُنیا کی چند روزہ زندگی میں مزے کرلیں، پھر ہماری طرف اُن کو پلٹنا ہے، پھر ہم اس کفر کے بدلے جس کا ارتکاب وہ کررہے ہیں ان کو سخت عذاب کا مزا چکھائیں گے۔ ع

اِن کو نوحؑ کا قصّہ سُناؤ،[۶۹] اُس وقت کا قصّہ جب اُس نے اپنی قوم سے کہا تھا کہ ”اے برادرانِ قوم! اگر میرا تمھارے درمیان رہنا اور اللہ کی آیات سُنا سُنا کر تمھیں غفلت سے بیدار کرنا تمھارے لیے

سی کمزوریوں، بہت سے نقائص اور بہت سی احتیاجوں کی تہمت لگی ہُوئی ہے۔ اسی بنا پر پہلے فقرے میں فرمایا گیا کہ اللہ تعالیٰ اُن تمام عُیوب، نقائص اور کمزوریوں سے پاک ہے جو تم اس کی طرف منسوب کر رہے ہو۔ دوسرے فقرے میں ارشاد ہوا کہ وہ اُن حاجتوں سے بھی بے نیاز ہے جن کی وجہ سے فانی انسانوں کو اولاد کی یا بیٹا بنانے کی ضرورت پیش آتی ہے۔ اور تیسرے فقرے میں صاف کہہ دیا گیا کہ زمین و آسمان میں سب اللہ کے بندے اور اس کے مملوک ہیں، ان میں سے کسی کے ساتھ بھی اللہ کا ایسا کوئی مخصوص ذاتی تعلّق نہیں ہے کہ سب کو چھوڑ کر اسے وہ اپنا بیٹا یا اکلوتا یا ولی عہد قرار دے لے۔ صفات کی بنا پر بے شک اللہ بعض بندوں کو بعض کی بہ نسبت زیادہ محبوب رکھتا ہے، مگر اس محبّت کے یہ معنیٰ نہیں ہیں کہ کسی بندے کو بندگی کے مقام سے اُٹھا کر خدائی میں شرکت کا مقام دے دیا جائے۔ زیادہ سے زیادہ اس محبّت کا تقاضا بس وہ ہے جو اس سے پہلے کی ایک آیت میں بیان کر دیا گیا ہے کہ ”جو ایمان لائے اور جنھوں نے تقویٰ کا رَوِیّہ اختیار کیا، ان کے لیے کسی خوف اور رنج کا موقع نہیں، دُنیا اور آخرت دونوں میں ان کے لیے بشارت ہی بشارت ہے۔“

۶۹— یہاں تک تو ان لوگوں کو معقول دلائل اور دل کو لگنے والے نصائح کے ساتھ سمجھایا گیا تھا کہ ان کے عقائد اور خیالات اور طریقوں میں غلطی کیا ہے اور وہ کیوں غلط ہے، اور اس کے مقابلے میں صحیح راہ کیا ہے اور وہ کیوں صحیح ہے۔ اب ان کے اُس طرزِ عمل کی طرف توجہ منعطف ہوتی ہے جو وہ اِس سیدھی سیدھی اور صاف صاف تفہیم و تلقین کے جواب میں اختیار کر رہے تھے۔ دس گیارہ سال سے ان کی رَوِش یہ تھی کہ وہ بجائے اس کے کہ اس معقول تنقید اور صحیح رہنمائی پر غور کر کے اپنی گمراہیوں پر نظرِ ثانی کرتے،

بِاٰيٰتِ اللّٰهِ فَعَلَى اللّٰهِ تَوَكَّلْتُ فَاَجْمِعُوْٓا اَمْرَكُمْ وَشُرَكَآءَكُمْ ثُمَّ لَا يَكُنْ اَمْرُكُمْ عَلَيْكُمْ غُمَّةً ثُمَّ اقْضُوْٓا اِلَيَّ وَلَا تُنْظِرُوْنِ ﴿٧١﴾ فَاِنْ تَوَلَّيْتُمْ فَمَا سَاَلْتُكُمْ مِّنْ اَجْرٍ ؕ اِنْ اَجْرِيَ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ ۙ وَ اُمِرْتُ اَنْ اَكُوْنَ مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ ﴿٧٢﴾ فَكَذَّبُوْهُ فَنَجَّيْنٰهُ وَمَنْ مَّعَهٗ فِي الْفُلْكِ وَجَعَلْنٰهُمْ خَلٰٓئِفَ وَاَغْرَقْنَا الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا ۚ

ناقابلِ برداشت ہوگیا ہے تو میرا بھروسا اللہ پر ہے، تم اپنے ٹھیرائے ہوئے شریکوں کو ساتھ لے کر ایک مُتّفقہ فیصلہ کرلو اور جو منصوبہ تمھارے پیشِ نظر ہو اس کو خوب سوچ سمجھ لو، تاکہ اس کا کوئی پہلو تمھاری نگاہ سے پوشیدہ نہ رہے، پھر میرے خلاف اس کو عمل میں لے آؤ اور مجھے ہرگز مُہلت نہ دو۔ تم نے میری نصیحت سے منہ موڑا (تو میرا کیا نقصان کیا) میں تم سے کسی اجر کا طلب گار نہ تھا، میرا اجر تو اللہ کے ذمّے ہے، اور مجھے حکم دیا گیا ہے کہ (خواہ کوئی مانے یا نہ مانے) میں خود مسلم بن کر رہوں۔"

انھوں نے اسے جھٹلایا اور نتیجہ یہ ہُوا کہ ہم نے اسے اور اُن لوگوں کو جو اس کے ساتھ کشتی میں تھے، بچالیا اور انھی کو زمین میں جانشین بنایا اور ان سب لوگوں کو غرق کر دیا جنھوں نے ہماری آیات کو جھٹلایا تھا۔

اُلٹے اُس شخص کی جان کے دشمن ہو گئے تھے جو اِن باتوں کو اپنی کسی ذاتی غرض کے لیے نہیں بلکہ انھی کے بھلے کے لیے پیش کر رہا تھا۔ وہ دلیلوں کا جواب پتھروں سے اور نصیحتوں کا جواب گالیوں سے دے رہے تھے۔ اپنی بستی میں ایسے شخص کا وجود ان کے لیے سخت ناگوار بلکہ ناقابلِ برداشت ہو گیا تھا جو غلط کو غلط کہنے والا ہو اور صحیح بات بتانے کی کوشش کرتا ہو۔ ان کا مطالبہ یہ تھا کہ ہم اندھوں کے درمیان جو آنکھوں والا پایا جاتا ہے وہ ہماری آنکھیں کھولنے کے بجائے اپنی آنکھیں بھی بند کر لے، ورنہ ہم زبردستی اس کی آنکھیں پھوڑ دیں گے، تاکہ بینائی جیسی چیز ہماری سرزمین میں نہ پائی جائے۔ یہ طرزِ عمل جو انھوں نے اختیار کر رکھا تھا، اس پر کچھ اور فرمانے کے بجائے اللہ تعالیٰ اپنے نبی کو حکم دیتا ہے کہ انھیں نوحؑ کا قصّہ سنا دو، اسی قصّے میں وہ اپنے اور تمھارے معاملے کا جواب بھی پالیں گے۔

۷۰ — یہ چیلنج تھا کہ میں اپنے کام سے باز نہ آؤں گا، تم میرے خلاف جو کچھ کرنا چاہتے ہو کر گزرو، میرا بھروسا اللہ پر ہے۔ (تقابُل کے لیے مُلاحظہ ہو: ہود، آیت ۵۵)

فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُنْذَرِيْنَ ﴿۷۳﴾ ثُمَّ بَعَثْنَا مِنْۢ بَعْدِهٖ رُسُلًا اِلٰى قَوْمِهِمْ فَجَآءُوْهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ فَمَا كَانُوْا لِيُؤْمِنُوْا بِمَا كَذَّبُوْا بِهٖ مِنْ قَبْلُ ۭ كَذٰلِكَ نَطْبَعُ عَلٰى قُلُوْبِ الْمُعْتَدِيْنَ ﴿۷۴﴾ ثُمَّ بَعَثْنَا مِنْۢ بَعْدِهِمْ مُّوْسٰى وَهٰرُوْنَ اِلٰى فِرْعَوْنَ وَمَلَا۟ىِٕهٖ بِاٰيٰتِنَا فَاسْتَكْبَرُوْا وَكَانُوْا قَوْمًا مُّجْرِمِيْنَ ﴿۷۵﴾ فَلَمَّا جَآءَهُمُ الْحَقُّ مِنْ عِنْدِنَا قَالُوْٓا اِنَّ هٰذَا لَسِحْرٌ مُّبِيْنٌ ﴿۷۶﴾ قَالَ مُوْسٰٓى

پس دیکھ لو کہ جنھیں متنبّہ کیا گیا تھا (اور پھر بھی انھوں نے مان کر نہ دیا) اُن کا کیا انجام ہُوا۔

پھر نوحؑ کے بعد ہم نے مختلف پیغمبروں کو اُن کی قوموں کی طرف بھیجا اور وہ اُن کے پاس کُھلی کُھلی نشانیاں لے کر آئے، مگر جس چیز کو انھوں نے پہلے جھٹلا دیا تھا، اسے پھر مان کر نہ دیا۔ اس طرح ہم حد سے گزر جانے والوں کے دلوں پر ٹھپّا لگا دیتے ہیں[۷۱]۔

پھر ان[۷۲] کے بعد ہم نے موسیٰؑ اور ہارونؑ کو اپنی نشانیوں کے ساتھ فرعون اور اس کے سرداروں کی طرف بھیجا، مگر انھوں نے اپنی بڑائی کا گھمنڈ کیا[۷۳] اور وہ مُجرم لوگ تھے۔ پس جب ہمارے پاس سے حق ان کے سامنے آیا تو انھوں نے کہہ دیا کہ یہ تو کُھلا جادو ہے[۷۴]۔ موسیٰؑ نے کہا:

---

۷۱ — حد سے گزر جانے والے لوگ وہ ہیں جو ایک مرتبہ غلطی کر جانے کے بعد پھر اپنی بات کی پچ اور ضد اور ہٹ دھرمی کی وجہ سے اپنی اُسی غلطی پر اڑے رہتے ہیں۔ اور جس بات کو ماننے سے ایک دفعہ انکار کر چکے ہیں، اُسے پھر کسی فہمایش، کسی تلقین اور کسی معقول سے معقول دلیل سے بھی مان کر نہیں دیتے۔ ایسے لوگوں پر آخر کار خدا کی ایسی پھٹکار پڑتی ہے کہ انھیں پھر کبھی راہِ راست پر آنے کی توفیق نہیں ملتی۔

۷۲ — اس موقع پر اُن حواشی کو پیشِ نظر رکھا جائے جو ہم نے سورۂ اَعراف (رکوع ۱۳ تا ۲۱) میں قصۂ موسیٰؑ و فرعون پر لکھے ہیں۔ جن اُمور کی تشریح وہاں کی جا چکی ہے ان کا اعادہ یہاں نہ کیا جائے گا۔

۷۳ — یعنی انھوں نے اپنی دولت و حکومت اور شوکت و حشمت کے نشے میں مدہوش ہو کر اپنے آپ کو بندگی کے مقام سے

اَتَقُوْلُوْنَ لِلْحَقِّ لَمَّا جَآءَكُمْ ؕ اَسِحْرٌ هٰذَا ؕ وَلَا يُفْلِحُ

”تم حق کو یہ کہتے ہو جب کہ وہ تمھارے سامنے آ گیا؟ کیا یہ جادُو ہے؟ حالانکہ جادُوگر فلاح نہیں

بالاتر سمجھ لیا اور اطاعت میں سر جُھکا دینے کے بجائے اکڑ دکھائی۔

۷۴ – یعنی حضرت موسیٰؑ کا پیغام سن کر وہی کچھ کہا جو کفارِ مکّہ نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا پیغام سن کر کہا تھا کہ ”یہ شخص تو کُھلا جادوگر ہے“ (مُلاحظہ ہو اِسی سورۂ یونُس کی دوسری آیت)۔

یہاں سلسلۂ کلام کو نگاہ میں رکھنے سے یہ بات صریح طور پر ظاہر ہو جاتی ہے کہ حضرت موسیٰ و ہارون علیہما السلام بھی دراصل اُسی خدمت پر مامور ہوئے تھے جس پر حضرت نوحؑ اور ان کے بعد کے تمام انبیاؑ، سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم تک، مامور ہوتے رہے ہیں۔ اس سورہ میں ابتدا سے ایک ہی مضمون چلا آ رہا ہے، اور وہ یہ کہ صرف اللہ رب العالمین کو اپنا رب اور الٰہ مانو اور یہ تسلیم کرو کہ تم کو اِس زندگی کے بعد دوسری زندگی میں اللہ کے سامنے حاضر ہونا اور اپنے عمل کا حساب دینا ہے۔ پھر جو لوگ پیغمبرؐ کی اس دعوت کو ماننے سے انکار کر رہے تھے، ان کو سمجھایا جا رہا ہے کہ نہ صرف تمھاری فلاح کا بلکہ ہمیشہ سے تمام انسانوں کی فلاح کا انحصار اِسی ایک بات پر رہا ہے کہ اس عقیدۂ توحید و آخرت کی دعوت کو، جسے ہر زمانے میں خدا کے پیغمبروں نے پیش کیا ہے، قبول کیا جائے اور اپنا پورا نظامِ زندگی اسی بنیاد پر قائم کر لیا جائے۔ فلاح صرف انھوں نے پائی جنھوں نے یہ کام کیا، اور جس قوم نے بھی اس سے انکار کیا وہ آخرِ کار تباہ ہو کر رہی۔ یہی اس سورت کا مرکزی مضمون ہے، اور اس سیاق میں جب تاریخی نظائر کے طور پر دوسرے انبیا کا ذکر آیا ہے تو لازماً اس کے یہی معنیٰ ہیں کہ جو دعوت اس سورہ میں دی گئی ہے وہی ان تمام انبیاؑ کی دعوت تھی، اور اسی کو لے کر حضرت موسیٰؑ و ہارونؑ بھی فرعون اور اس کی قوم کے سرداروں کے پاس گئے تھے۔ اگر واقعہ وہ ہوتا جو بعض لوگوں نے گمان کیا ہے کہ حضرت موسیٰؑ و ہارونؑ کا مشن ایک خاص قوم کو دوسری قوم کی غلامی سے رہا کرانا تھا، تو اس سیاق و سباق میں اس واقعے کو تاریخی نظیر کے طور پر پیش کرنا بالکل بے جوڑ ہوتا۔ اس میں شک نہیں کہ ان دونوں حضرات کے مشن کا ایک جُزیہ بھی تھا کہ بنی اسرائیل (ایک مسلمان قوم) کو ایک کافر قوم کے تسلّط سے (اگر وہ اپنے کفر پر قائم رہے) نجات دلائیں۔ لیکن یہ ایک ضمنی مقصد تھا، نہ کہ اصل مقصدِ بِعثَت۔ اصل مقصد تو وہی تھا جو قرآن کی رُو سے تمام انبیاؑ کی بِعثَت کا مقصد رہا ہے اور سورۂ نازعات میں جس کو صاف طور پر بیان بھی کر دیا گیا ہے کہ اِذْهَبْ اِلٰى فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰى ۞ فَقُلْ هَلْ لَّكَ اِلٰٓى اَنْ تَزَكّٰى ۞ وَاَهْدِيَكَ اِلٰى رَبِّكَ فَتَخْشٰى ۞ ”فرعون کے پاس جا کیونکہ وہ حدِّ بندگی سے گزر گیا ہے اور اس سے کہہ: کیا تُو اس کے لیے تیار ہے کہ سدھر جائے، اور میں تجھے تیرے ربّ کی طرف رہنمائی کروں تو تُو اُس سے ڈرے؟“ مگر چونکہ فرعون اور اُس کے اَعیانِ سلطنت نے اس دعوت کو قبول نہیں کیا اور آخر کار حضرت موسیٰؑ کو یہی کرنا پڑا کہ اپنی مسلمان قوم کو اس کے تسلّط سے نکال لے جائیں، اس لیے ان کے مشن کا یہی جُز تاریخ میں نمایاں ہو گیا اور قرآن میں بھی اس کو ویسا ہی نمایاں کر کے پیش کیا گیا جیسا کہ وہ تاریخ میں فی الواقع ہے۔ جو شخص قرآن کی تفصیلات کو اس کے کُلّیات سے جدا کر کے دیکھنے کی غلطی نہ کرتا ہو، بلکہ انھیں کُلّیات کے تابع کر کے ہی دیکھتا اور سمجھتا ہو، وہ کبھی اس غلط فہمی میں نہیں پڑ سکتا کہ ایک قوم کی رہائی کسی نبی کی بِعثَت کا

السّٰحِرُوْنَ ﴿۷۷﴾ قَالُوْٓا اَجِئْتَنَا لِتَلْفِتَنَا عَمَّا وَجَدْنَا عَلَيْهِ اٰبَآءَنَا وَتَكُوْنَ لَكُمَا الْكِبْرِيَآءُ فِى الْاَرْضِ ؕ وَمَا نَحْنُ لَكُمَا بِمُؤْمِنِيْنَ ﴿۷۸﴾ وَقَالَ فِرْعَوْنُ ائْتُوْنِىْ بِكُلِّ سٰحِرٍ عَلِيْمٍ ﴿۷۹﴾ فَلَمَّا جَآءَ السَّحَرَةُ قَالَ لَهُمْ مُّوْسٰٓى اَلْقُوْا مَآ اَنْتُمْ مُّلْقُوْنَ ﴿۸۰﴾ فَلَمَّآ اَلْقَوْا قَالَ مُوْسٰى مَا جِئْتُمْ بِهِ ۙ السِّحْرُ ؕ اِنَّ اللّٰهَ

پایا کرتے[۷۵]۔" انھوں نے جواب میں کہا "کیا تُو اس لیے آیا ہے کہ ہمیں اُس طریقے سے پھیر دے جس پر ہم نے اپنے باپ دادا کو پایا ہے اور زمین میں بڑائی تم دونوں کی قائم ہو جائے[۷۶]؟ تمھاری بات تو ہم ماننے والے نہیں ہیں۔" اور فرعون نے (اپنے آدمیوں سے) کہا کہ "ہر ماہرِ فن جادُوگر کو میرے پاس حاضر کرو"۔۔۔۔ جب جادوگر آ گئے تو موسیٰؑ نے ان سے کہا: "جو کچھ تمھیں پھینکنا ہے پھینکو۔" پھر جب انھوں نے اپنے اَنچھر پھینک دیے تو موسیٰؑ نے کہا: "یہ جو کچھ تم نے پھینکا ہے یہ جادُو ہے[۷۷]، اللہ ابھی

اصل مقصد، اور دینِ حق کی دعوت محض اس کا ایک ضمنی مقصد ہو سکتی ہے۔ (مزید تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: طٰہٰ، آیات ۴۴ تا ۵۲۔ الزُّخرُف، ۴۶ تا ۵۶۔ المُزَّمِّل ۱۵-۱۶)۔

۷۵ – مطلب یہ ہے کہ ظاہر نظر میں جادو اور معجزے کے درمیان جو مُشابہت ہوتی ہے، اس کی بنا پر تم لوگوں نے بے تکلّف اِسے جادو قرار دے دیا، مگر نادانو! تم نے یہ نہ دیکھا کہ جادوگر کس سیرت و اخلاق کے لوگ ہوتے ہیں اور کن مقاصد کے لیے جادوگری کیا کرتے ہیں۔ کیا کسی جادوگر کا یہی کام ہوتا ہے کہ بے غرض اور بے دھڑک ایک جبّار فرماں روا کے دربار میں آئے اور اسے اس کی گمراہی پر سرزنش کرے اور خدا پرستی اور طہارتِ نفس اختیار کرنے کی دعوت دے؟ تمھارے ہاں کوئی جادوگر آیا ہوتا تو پہلے درباریوں کے پاس خوشامدیں کرتا پھرتا کہ ذرا سرکار میں مجھے اپنے کمالات دکھانے کا موقع دلوا دو، پھر جب اسے دربار میں رسائی نصیب ہوتی تو عام خوشامدیوں سے بھی کچھ بڑھ کر ذلّت کے ساتھ سلامیاں بجا لاتا، چیخ چیخ کر درازیِ عُمر و اقبال کی دعائیں دیتا، بڑی منت سماجت کے ساتھ درخواست کرتا کہ سرکار! کچھ فدوی کے کمالات بھی مُلاحظہ فرمائیں، اور جب تم اس کے تماشے دیکھ لیتے تو ہاتھ پھیلا دیتا کہ حضور! کچھ انعام مل جائے۔

اس پورے مضمون کو صرف ایک فقرے میں سمیٹ دیا ہے کہ جادوگر فلاح یافتہ انسان نہیں ہُوا کرتے۔

۷۶ – ظاہر ہے کہ اگر حضرت موسیٰؑ و ہارونؑ کا اصل مطالبہ رہائیِ بنی اسرائیل کا ہوتا تو فرعون اور اس کے درباریوں کو یہ اندیشہ کرنے کی کوئی ضرورت نہ تھی کہ ان دونوں بزرگوں کی دعوت پھیلنے سے سرزمینِ مصر کا دین بدل جائے گا اور ملک میں

سَيُبۡطِلُهٗ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُصۡلِحُ عَمَلَ الۡمُفۡسِدِيۡنَ ﴿۸۱﴾ وَيُحِقُّ اللّٰهُ الۡحَـقَّ بِكَلِمٰتِهٖ وَلَوۡ كَرِهَ الۡمُجۡرِمُوۡنَ ﴿۸۲﴾ ع فَمَاۤ اٰمَنَ لِمُوۡسٰٓى اِلَّا ذُرِّيَّةٌ مِّنۡ قَوۡمِهٖ عَلٰى خَوۡفٍ مِّنۡ فِرۡعَوۡنَ وَمَلَا۟ئِهِمۡ اَنۡ

اِسے باطل کیے دیتا ہے، مفسدوں کے کام کو اللہ سُدھرنے نہیں دیتا، اور اللہ اپنے فرمانوں سے حق کو حق کر دکھاتا ہے، خواہ مجرموں کو وہ کتنا ہی ناگوار ہو۔" ع

(پھر دیکھو کہ) موسیٰؑ کو اس کی قوم میں سے چند نوجوانوں[۷۸] کے سوا کسی نے نہ مانا[۷۹]، فرعون کے ڈر سے اور خود اپنی قوم کے سربرآوردہ لوگوں کے ڈر سے (جنھیں خوف تھا کہ) فرعون ان کو عذاب میں

ہمارے بجائے اِن کی بڑائی قائم ہوجائے گی۔ ان کے اس اندیشے کی وجہ تو یہی تھی کہ حضرت موسیٰؑ اہلِ مصر کو بندگیِ حق کی طرف دعوت دے رہے تھے اور اس سے وہ مشرکانہ نظام خطرے میں تھا جس پر فرعون کی بادشاہی اور اس کے سرداروں کی سرداری اور مذہبی پیشواؤں کی پیشوائی قائم تھی۔ (مزید تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: الاعراف، حاشیہ ۶۶۔ المومن، حاشیہ ۴۳)

۷۷- یعنی جادُو وہ نہ تھا جو میں نے دکھایا تھا، جادُو یہ ہے جو تم دکھا رہے ہو۔

۷۸- متن میں لفظ ذُرِّيَّةٌ استعمال ہُوا ہے جس کے معنیٰ اولاد کے ہیں۔ ہم نے اس کا ترجمہ "نوجوان" کیا ہے۔ مگر دراصل اس خاص لفظ کے استعمال سے جو بات قرآنِ مجید بیان کرنا چاہتا ہے وہ یہ ہے کہ اُس پُرخطر زمانے میں حق کا ساتھ دینے اور عَلَم بردارِ حق کو اپنا رہنما تسلیم کرنے کی جرأت چند لڑکوں اور لڑکیوں نے تو کی مگر ماؤں اور باپوں اور قوم کے سِن رسیدہ لوگوں کو اس کی توفیق نصیب نہ ہوئی۔ ان پر مَصلَحت پرستی اور دنیوی اغراض کی بندگی اور عافیت کوشی کچھ اس طرح چھائی رہی کہ وہ ایسے حق کا ساتھ دینے پر آمادہ نہ ہوئے جس کا راستہ اُن کو خطرات سے پُرنظر آ رہا تھا، بلکہ وہ اُلٹے نوجوانوں ہی کو روکتے رہے کہ موسیٰؑ کے قریب نہ جاؤ، ورنہ تم خود بھی فرعون کے غضب میں مبتلا ہوگے اور ہم پر بھی آفت لاؤ گے۔

یہ بات خاص طور پر قرآن نے نمایاں کر کے اس لیے پیش کی ہے کہ مکّہ کی آبادی میں سے بھی محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا ساتھ دینے کے لیے جو لوگ آگے بڑھے تھے وہ قوم کے بڑے بوڑھے اور سِن رسیدہ لوگ نہ تھے بلکہ چند باہمت نوجوان ہی تھے۔ وہ ابتدائی مسلمان جو اِن آیات کے نزول کے وقت ساری قوم کی شدید مخالفت کے مقابلے میں صداقتِ اسلامی کی حمایت کر رہے تھے اور ظلم و ستم کے اس طوفان میں جن کے سینے اسلام کے لیے سپر بنے ہوئے تھے، ان میں مَصلَحت کوش بوڑھا کوئی نہ تھا، سب کے سب جوان لوگ ہی تھے۔ علیؓ ابن ابی طالب، جعفرؓ طیّار، زُبیرؓ، طلحہؓ، سعدؓ بن ابی وقاص، مُصعبؓ بن عُمیر، عبداللہؓ بن مسعود جیسے لوگ قبولِ اسلام کے وقت ۲۰ سال سے کم عمر کے تھے۔ عبدالرحمٰنؓ بن عوف، بلالؓ اور صُہیبؓ کی عمریں ۲۰ اور ۳۰ کے درمیان تھیں۔

يَّفۡتِنَهُمۡ‌ؕ وَاِنَّ فِرۡعَوۡنَ لَعَالٍ فِى الۡاَرۡضِ‌ۚ وَاِنَّهٗ لَمِنَ الۡمُسۡرِفِيۡنَ ﴿۸۳﴾

مبتلا کرے گا۔ اور واقعہ یہ ہے کہ فرعون زمین میں غلبہ رکھتا تھا اور وہ اُن لوگوں میں سے تھا جو کسی حد پر رُکتے نہیں ہیں۔[۸۰]

ابوعُبَیدہؓ بن الجرّاح، زیدؓ بن حارثہ، عثمانؓ بن عفّان اور عمرِ فاروقؓ ۳۰ اور ۳۵ سال کے درمیان عمر کے تھے۔ ان سے زیادہ سِن رسیدہ ابوبکر صدیقؓ تھے اور ان کی عمر بھی ایمان لانے کے وقت ۳۸ سال سے زیادہ نہ تھی۔ ابتدائی مسلمانوں میں صرف ایک صحابی کا نام ہمیں ملتا ہے جن کی عمر نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ تھی، یعنی حضرت عُبَیدہؓ بن حارث مُطّلبی۔ اور غالباً پورے گروہ میں ایک ہی صحابی حضورؐ کے ہم عمر تھے، یعنی عمّار بن یاسرؓ۔

۷۹ – متن میں فَمَآ اٰمَنَ لِمُوۡسٰٓی کے الفاظ ہیں۔ اس سے بعض لوگوں کو شبہ ہوا کہ شاید بنی اسرائیل سب کے سب کافر تھے اور ابتداءً ان میں سے صرف چند آدمی ایمان لائے۔ لیکن ایمان کے ساتھ جب لام کا صلہ آتا ہے تو وہ بالعموم اطاعت وانقیاد کے معنیٰ دیتا ہے، یعنی کسی کی بات ماننا اور اس کے کہے پر چلنا۔ پس دراصل ان الفاظ کا مفہوم یہ ہے کہ چند نوجوانوں کو چھوڑ کر بنی اسرائیل کی پوری قوم میں سے کوئی بھی اس بات پر آمادہ نہ ہوا کہ حضرت موسیٰؑ کو اپنا رہبر و پیشوا مان کر ان کی پیروی اختیار کر لیتا اور اس دعوتِ اسلامی کے کام میں ان کا ساتھ دیتا۔ پھر بعد کے فقرے نے اس بات کو واضح کر دیا کہ ان کے اس طرزِ عمل کی اصل وجہ یہ نہ تھی کہ انھیں حضرت موسیٰؑ کے صادق اور ان کی دعوت کے حق ہونے میں کوئی شک تھا، بلکہ اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ وہ اور خُصوصاً ان کے اکابر و اشراف، حضرت موسیٰؑ کا ساتھ دے کر اپنے آپ کو فرعون کی سخت گیری کے خطرے میں ڈالنے کے لیے تیار نہ تھے۔ اگرچہ یہ لوگ نسلی اور مذہبی دونوں حیثیتوں سے ابراہیم، اسحاق، یعقوب اور یوسف علیہم السلام کے اُمّتی تھے، اور اس بنا پر ظاہر ہے کہ سب مسلمان تھے، لیکن ایک مدّتِ دراز کے اَخلاقی انحطاط نے اور اس پست ہمتی نے جو زیردستی سے پیدا ہوئی تھی، ان میں اتنا بَل بُوتا باقی نہ چھوڑا تھا کہ کفر وضلالت کی فرماں روائی کے مقابلے میں ایمان وہدایت کا عَلَم لے کر خود اُٹھتے، یا جو اُٹھا تھا اس کا ساتھ دیتے۔

حضرت موسیٰؑ اور فرعون کی اس کش مکش میں عام اسرائیلیوں کا طرزِ عمل کیا تھا، اس کا اندازہ بائبل کی اس عبارت سے ہو سکتا ہے:

> ”جب وہ فرعون کے پاس سے نکلے آ رہے تھے تو اُن کو موسیٰؑ اور ہارونؑ ملاقات کے لیے راستے پر کھڑے ملے۔ تب انھوں نے ان سے کہا کہ خداوند ہی دیکھے اور تمھارا انصاف کرے، تم نے تو ہم کو فرعون اور اس کے خادموں کی نگاہ میں ایسا گھنونا کیا ہے کہ ہمارے قتل کے لیے ان کے ہاتھ میں تلوار دے دی ہے۔“ (خُروج ۶:۲۰-۲۱)

تلمُود میں لکھا ہے کہ بنی اسرائیل موسیٰ اور ہارون علیہما السلام سے کہتے تھے:

> ”ہماری مثال تو ایسی ہے جیسے ایک بھیڑیے نے بکری کو پکڑا اور چرواہے نے آکر اس کو بچانے کی کوشش کی، اور دونوں کی کش مکش میں بکری کے ٹکڑے اُڑ گئے۔ بس اسی طرح تمھاری اور فرعون کی کھینچ تان میں ہمارا کام تمام ہو کر رہے گا۔“

وَقَالَ مُوْسٰى يٰقَوْمِ اِنْ كُنْتُمْ اٰمَنْتُمْ بِاللّٰهِ فَعَلَيْهِ تَوَكَّلُوْٓا اِنْ كُنْتُمْ مُّسْلِمِيْنَ ﴿۸۴﴾ فَقَالُوْا عَلَى اللّٰهِ تَوَكَّلْنَا ۚ رَبَّنَا لَا تَجْعَلْنَا فِتْنَةً لِّلْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۸۵﴾ وَنَجِّنَا بِرَحْمَتِكَ مِنَ الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۸۶﴾

موسیٰؑ نے اپنی قوم سے کہا کہ ''لوگو! اگر تم واقعی اللہ پر ایمان رکھتے ہو تو اس پر بھروسا کرو اگر مسلمان ہو۔''[81] انھوں نے جواب دیا:[82] ''ہم نے اللہ ہی پر بھروسا کیا، اے ہمارے رب! ہمیں ظالم لوگوں کے لیے فتنہ نہ بنا[83] اور اپنی رحمت سے ہم کو کافروں سے نجات دے۔''

اِنھی باتوں کی طرف سورۂ اعراف میں بھی اشارہ کیا گیا ہے کہ بنی اسرائیل نے حضرت موسیٰؑ سے کہا کہ اُوْذِيْنَا مِنْ قَبْلِ اَنْ تَاْتِيَنَا وَمِنْۢ بَعْدِ مَا جِئْتَنَا (آیت ۱۲۹)۔

۸۰ — متن میں لفظ مُسْرِفِيْنَ استعمال ہُوا ہے، جس کے معنیٰ ہیں: حد سے تجاوز کرنے والا۔ مگر اس لفظی ترجمے سے اس کی اصل روح نمایاں نہیں ہوتی۔ مُسرِفین سے مراد دراصل وہ لوگ ہیں جو اپنے مطلب کے لیے کسی بُرے سے بُرے طریقے کو بھی اختیار کرنے میں تأمّل نہیں کرتے۔ کسی ظلم اور کسی بداخلاقی اور کسی وحشت و بربریت کے ارتکاب سے نہیں چُوکتے۔ اپنی خواہشات کے پیچھے ہر انتہا تک جاسکتے ہیں۔ ان کے لیے کوئی حد نہیں جس پر جا کر وہ رُک جائیں۔

۸۱ — ظاہر ہے کہ یہ الفاظ کسی کافر قوم کو خطاب کر کے نہیں کہے جاسکتے تھے۔ حضرت موسیٰؑ کا یہ ارشاد صاف بتا رہا ہے کہ بنی اسرائیل کی پوری قوم اس وقت مسلمان تھی، اور حضرت موسیٰؑ اُن کو یہ تلقین فرما رہے تھے کہ اگر تم واقعی مسلمان ہو، جیسا کہ تمھارا دعویٰ ہے، تو فرعون کی طاقت سے خوف نہ کھاؤ بلکہ اللہ کی طاقت پر بھروسا کرو۔

۸۲ — یہ جواب ان نوجوانوں کا تھا جو موسیٰ علیہ السلام کا ساتھ دینے پر آمادہ ہوئے تھے۔ یہاں قَالُوْا کی ضمیر قوم کی طرف نہیں بلکہ ذُرِّيَّةٌ کی طرف پھر رہی ہے جیسا کہ سیاقِ کلام سے خود ظاہر ہے۔

۸۳ — ان صادق الایمان نوجوانوں کی یہ دعا کہ ''ہمیں ظالم لوگوں کے لیے فتنہ نہ بنا''، بڑے وسیع مفہوم پر حاوی ہے۔ گمراہی کے عام غلبہ و تسلّط کی حالت میں جب کچھ لوگ قیامِ حق کے لیے اُٹھتے ہیں، تو انھیں مختلف قسم کے ظالموں سے سابقہ پیش آتا ہے۔ ایک طرف باطل کے اصلی عَلَم بردار ہوتے ہیں جو پوری طاقت سے اِن داعیانِ حق کو کچل دینا چاہتے ہیں۔ دوسری طرف نام نہاد حق پرستوں کا ایک اچھا خاصا گروہ ہوتا ہے جو حق کو ماننے کا دعویٰ تو کرتا ہے مگر باطل کی قاہرانہ فرماں روائی کے مقابلے میں اقامتِ حق کی سعی کو غیر واجب، لاحاصل، یا حماقت سمجھتا ہے اور اس کی انتہائی کوشش یہ ہوتی ہے کہ اپنی اس خیانت کو جو وہ حق کے ساتھ کر رہا ہے، کسی نہ کسی طرح درست ثابت کر دے اور ان لوگوں کو اُلٹا برسرِ باطل ثابت کر کے اپنے ضمیر کی اُس خلش

وَ اَوْحَیْنَاۤ اِلٰی مُوْسٰی وَ اَخِیْهِ اَنْ تَبَوَّاٰ لِقَوْمِكُمَا بِمِصْرَ بُیُوْتًا وَّ اجْعَلُوْا بُیُوْتَكُمْ قِبْلَةً وَّ اَقِیْمُوا الصَّلٰوةَ ؕ وَ بَشِّرِ الْمُؤْمِنِیْنَ ﴿۸۷﴾

اور ہم نے موسیٰؑ اور اس کے بھائی کو اشارہ کیا کہ ’’مصر میں چند مکان اپنی قوم کے لیے مہیّا کرو اور اپنے ان مکانوں کو قبلہ ٹھیرالو اور نماز قائم کرو[۸۴] اور اہلِ ایمان کو بشارت دے[۸۵] دو۔‘‘

کو مٹائے جو اُن کی دعوتِ اقامتِ دینِ حق سے اس کے دل کی گہرائیوں میں جلی یا خفی طور پر پیدا ہوتی ہے۔ تیسری طرف عامۃ الناس ہوتے ہیں جو الگ کھڑے تماشا دیکھ رہے ہوتے ہیں اور ان کا ووٹ آخرِ کار اُسی طاقت کے حق میں پڑا کرتا ہے جس کا پلّا بھاری رہے، خواہ وہ طاقت حق ہو یا باطل۔ اس صورتِ حال میں ان داعیانِ حق کی ہرنا کامی، ہر مصیبت، ہر غلطی، ہر کمزوری اور ہر خامی ان مختلف گروہوں کے لیے مختلف طور پر فتنہ بن جاتی ہے۔ وہ کچل ڈالے جائیں یا شکست کھا جائیں تو پہلا گروہ کہتا ہے کہ حق ہمارے ساتھ تھا، نہ کہ ان بے وقوفوں کے ساتھ جو ناکام ہو گئے۔ دوسرا گروہ کہتا ہے کہ دیکھ لیا! ہم نہ کہتے تھے کہ ایسی بڑی بڑی طاقتوں سے ٹکرانے کا حاصل چند قیمتی جانوں کی ہلاکت کے سوا کچھ نہ ہوگا، اور آخرِ کار اس تہلکہ میں اپنے آپ کو ڈالنے کا ہمیں شریعت نے مکلّف ہی کب کیا تھا، دین کے کم سے کم ضروری مطالبات تو اُن عقائد و اعمال سے پورے ہو ہی رہے تھے جن کی اجازت فراعنۂ وقت نے دے رکھی تھی۔ تیسرا گروہ فیصلہ کر دیتا ہے کہ حق وہی ہے جو غالب رہا۔ اسی طرح اگر وہ اپنی دعوت کے کام میں کوئی غلطی کر جائیں، یا مصائب و مشکلات کی سہار نہ ہونے کی وجہ سے کمزوری دکھا جائیں، یا ان سے، بلکہ ان کے کسی ایک فرد سے بھی کسی اخلاقی عیب کا صُدور ہو جائے، تو بہت سے لوگوں کے لیے باطل سے چمٹے رہنے کے ہزار بہانے نکل آتے ہیں اور پھر اس دعوت کی ناکامی کے بعد مدت ہائے دراز تک کسی دوسری دعوتِ حق کے اُٹھنے کا امکان باقی نہیں رہتا۔ پس یہ بڑی معنیٰ خیز دُعا تھی جو موسیٰ علیہ السلام کے ان ساتھیوں نے مانگی تھی کہ خدایا! ہم پر ایسا فضل فرما کہ ہم ظالموں کے لیے فتنہ بن کر نہ رہ جائیں۔ یعنی ہم کو غلطیوں سے، خامیوں سے، کمزوریوں سے بچا، اور ہماری سعی کو دنیا میں بار آور کر دے، تاکہ ہمارا وجود تیری خَلق کے لیے سببِ خیر بنے نہ کہ ظالموں کے لیے وسیلۂ شر۔

۸۴ – اس آیت کے مفہوم میں مفسرین کے درمیان اختلاف ہے۔ اس کے الفاظ پر اور اس ماحول پر جس میں یہ الفاظ ارشاد فرمائے گئے تھے، غور کرنے سے مَیں یہ سمجھا ہوں کہ غالباً مصر میں حکومت کے تشدُّد سے اور خود بنی اسرائیل کے اپنے ضُعفِ ایمانی کی وجہ سے اسرائیلی اور مصری مسلمانوں کے ہاں نمازِ باجماعت کا نظام ختم ہو چکا تھا، اور یہ ان کے شیرازے کے بکھرنے اور ان کی دینی روح پر موت طاری ہو جانے کا ایک بہت بڑا سبب تھا۔ اس لیے حضرت موسیٰؑ کو حکم دیا گیا کہ اس نظام کو از سرِ نو قائم کریں اور مصر میں چند مکان اس غرض کے لیے تعمیر یا تجویز کر لیں کہ وہاں اجتماعی نماز ادا کی جایا کرے۔ کیونکہ ایک بگڑی ہوئی اور بکھری ہوئی مسلمان قوم میں دینی روح کو پھر سے زندہ کرنے اور اس کی منتشر طاقت کو از سرِ نو مجتمع کرنے کے لیے اسلامی طرز پر جو کوشش بھی کی

وَقَالَ مُوْسٰى رَبَّنَآ اِنَّكَ اٰتَيْتَ فِرْعَوْنَ وَمَلَاَهٗ زِيْنَةً وَّاَمْوَالًا فِى الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۙ رَبَّنَا لِيُضِلُّوْا عَنْ سَبِيْلِكَ ۚ رَبَّنَا اطْمِسْ عَلٰٓى اَمْوَالِهِمْ وَاشْدُدْ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ فَلَا يُؤْمِنُوْا حَتّٰى يَرَوُا الْعَذَابَ الْاَلِيْمَ ﴿۸۸﴾ قَالَ قَدْ اُجِيْبَتْ دَّعْوَتُكُمَا فَاسْتَقِيْمَا وَ

موسیٰؑ نے دُعا کی[۸۶]: ”اے ہمارے رب! تُو نے فرعون اور اس کے سرداروں کو دُنیا کی زندگی میں زینت[۸۷] اور اموال[۸۸] سے نواز رکھا ہے۔ اے رب! کیا یہ اس لیے ہے کہ وہ لوگوں کو تیری راہ سے بھٹکائیں؟ اے رب! ان کے مال غارت کر دے اور ان کے دلوں پر ایسی مُہر کر دے کہ ایمان نہ لائیں جب تک دردناک عذاب نہ دیکھ لیں[۸۹]۔“ اللہ تعالیٰ نے جواب میں فرمایا: ”تم دونوں کی دُعا قبول کی گئی۔ ثابت قدم رہو اور

جائے گی، اُس کا پہلا قدم لازماً یہی ہوگا کہ اس میں نمازِ باجماعت کا نظام قائم کیا جائے۔ ان مکانوں کو قبلہ ٹھیرانے کا مفہوم میرے نزدیک یہ ہے کہ ان مکانوں کو ساری قوم کے لیے مرکز اور مَرجع ٹھیرایا جائے، اور اس کے بعد ہی ”نماز قائم کرو“ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ متفرق طور پر اپنی اپنی جگہ نماز پڑھ لینے کے بجائے لوگ ان مقرّر مقامات پر جمع ہو کر نماز پڑھا کریں، کیونکہ قرآن کی اصطلاح میں ”اقامتِ صلوٰۃ“ جس چیز کا نام ہے اس کے مفہوم میں لازماً نمازِ باجماعت بھی شامل ہے۔

۸۵ – یعنی اہلِ ایمان پر مایوسی، مرعوبیت اور پژمُردگی کی جو کیفیت اس وقت چھائی ہوئی ہے اسے دُور کرو۔ انھیں پُراُمید بناؤ، ان کی ہمت بندھاؤ اور ان کا حوصلہ بڑھاؤ۔ ”بشارت دینے“ کے لفظ میں یہ سب معنیٰ شامل ہیں۔

۸۶ – اُوپر کی آیات حضرت موسیٰؑ کی دعوت کے ابتدائی دَور سے تعلّق رکھتی ہیں۔ اور یہ دعا زمانۂ قیامِ مصر کے بالکل آخری زمانے کی ہے۔ بیچ میں کئی برس کا طویل فاصلہ ہے جس کی تفصیلات کو یہاں نظرانداز کر دیا گیا ہے۔ دوسرے مقامات پر قرآنِ مجید میں اس بیچ کے دَور کا بھی مفصّل حال بیان ہُوا ہے۔

۸۷ – یعنی ٹھاٹ، شان و شوکت اور تمدّن و تہذیب کی وہ خوش نمائی جس کی وجہ سے دنیا اُن پر اور اُن کے طور طریقوں پر ریجھتی ہے اور ہر شخص کا دل چاہتا ہے کہ ویسا ہی بن جائے جیسے وہ ہیں۔

۸۸ – یعنی ذرائع اور وسائل جن کی فراوانی کی وجہ سے وہ اپنی تدبیروں کو عمل میں لانے کے لیے ہر طرح کی آسانیاں رکھتے ہیں اور جن کے فُقدان کی وجہ سے اہلِ حق اپنی تدبیروں کو عمل میں لانے سے عاجز رہ جاتے ہیں۔

۸۹ – جیسا کہ ابھی ہم بتا چکے ہیں، یہ دُعا حضرت موسیٰؑ نے زمانۂ قیامِ مصر کے بالکل آخری زمانے میں کی تھی، اور

لَا تَتَّبِعٰٓنِّ سَبِيْلَ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿٨٩﴾ وَجٰوَزْنَا بِبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ الْبَحْرَ فَاَتْبَعَهُمْ فِرْعَوْنُ وَجُنُوْدُهٗ بَغْيًا وَّعَدْوًا ؕ حَتّٰٓى اِذَآ اَدْرَكَهُ الْغَرَقُ ۙ قَالَ اٰمَنْتُ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّا الَّذِيْٓ اٰمَنَتْ بِهٖ بَنُوْٓا اِسْرَآءِيْلَ وَاَنَا مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ ﴿٩٠﴾ آٰلْئٰنَ وَقَدْ عَصَيْتَ قَبْلُ

اُن لوگوں کے طریقے کی ہرگز پیروی نہ کرو جو علم نہیں رکھتے[90]۔"

اور ہم بنی اسرائیل کو سمندر سے گزار لے گئے۔ پھر فرعون اور اس کے لشکر ظلم اور زیادتی کی غرض سے ان کے پیچھے چلے ـــــ حتّٰی کہ جب فرعون ڈوبنے لگا تو بول اُٹھا: "میں نے مان لیا کہ خداوندِ حقیقی اُس کے سوا کوئی نہیں ہے جس پر بنی اسرائیل ایمان لائے، اور میں بھی سرِ اطاعت جُھکا دینے والوں میں سے ہوں[91]۔ (جواب دیا گیا:) "اب ایمان لاتا ہے! حالانکہ اِس سے پہلے تک تُو نافرمانی کرتا رہا

اس وقت کی تھی جب پے دَر پے نشانات دیکھ لینے اور دین کی حُجّت پوری ہو جانے کے بعد بھی فرعون اور اس کے اَعیانِ سلطنت حق کی دشمنی پر انتہائی ہٹ دھرمی کے ساتھ جمے رہے۔ ایسے موقع پر پیغمبر جو بددعا کرتا ہے وہ ٹھیک وہی ہوتی ہے جو کفر پر اصرار کرنے والوں کے بارے میں خود اللہ تعالیٰ کا فیصلہ ہے، یعنی یہ کہ پھر انھیں ایمان کی توفیق نہ بخشی جائے۔

۹۰ – جو لوگ حقیقت کو نہیں جانتے اور اللہ تعالیٰ کی مَصْلَحتوں کو نہیں سمجھتے، وہ باطل کے مقابلے میں حق کی کمزوری، اور اقامتِ حق کے لیے سعی کرنے والوں کی مسلسل ناکامیاں، اور ائمۂ باطل کے ٹھاٹ اور ان کی دنیوی سرفرازیاں دیکھ کر یہ گمان کرنے لگتے ہیں کہ شاید اللہ تعالیٰ کو یہی منظور ہے کہ اس کے باغی دُنیا پر چھائے رہیں، اور شاید حضرتِ حق خود ہی باطل کے مقابلے میں حق کی تائید کرنا نہیں چاہتے۔ پھر وہ نادان لوگ آخرِ کار اپنی بدگمانیوں کی بِنا پر یہ نتیجہ نکال بیٹھتے ہیں کہ اقامتِ حق کی سعی لاحاصل ہے اور اب مناسب یہی ہے کہ اُس ذرا سی دین داری پر راضی ہو کر بیٹھ رہا جائے جس کی اجازت کفر و فسق کی سلطانی میں مل رہی ہو۔ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰؑ کو اور ان کے پیروؤں کو اسی غلطی سے بچنے کی تاکید فرمائی ہے۔ ارشادِ خداوندی کا منشا یہ ہے کہ صبر کے ساتھ اِنھی ناموافق حالات میں کام کیے جاؤ، کہیں ایسا نہ ہو کہ تمھیں بھی وہی غلط فہمی ہو جائے جو ایسے حالات میں جاہلوں اور نادانوں کو عُموماً لاحق ہو جایا کرتی ہے۔

۹۱ – بائبل میں اس واقعے کا کوئی ذکر نہیں ہے، مگر تَلْمُود میں تصریح ہے کہ ڈوبتے وقت فرعون نے کہا: "میں تجھ پر ایمان

وَكُنْتَ مِنَ الْمُفْسِدِيْنَ ﴿٩١﴾ فَالْيَوْمَ نُنَجِّيْكَ بِبَدَنِكَ لِتَكُوْنَ لِمَنْ خَلْفَكَ اٰيَةً ۭ وَاِنَّ كَثِيْرًا مِّنَ النَّاسِ عَنْ اٰيٰتِنَا لَغٰفِلُوْنَ ﴿٩٢﴾ ع وَلَقَدْ بَوَّاْنَا بَنِيْٓ اِسْرَاۗءِيْلَ مُبَوَّاَ صِدْقٍ وَّرَزَقْنٰھُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ ۚ فَمَا اخْتَلَفُوْا حَتّٰى جَاۗءَھُمُ الْعِلْمُ ۭ اِنَّ رَبَّكَ يَقْضِيْ

اور فساد برپا کرنے والوں میں سے تھا۔ اب تو ہم صرف تیری لاش ہی کو بچائیں گے، تاکہ تُو بعد کی نسلوں کے لیے نشانِ عبرت بنے[92]، اگرچہ بہت سے انسان ایسے ہیں جو ہماری نشانیوں سے غفلت برتتے ہیں[93]۔" ع

ہم نے بنی اسرائیل کو بہت اچھا ٹھکانا دیا[94] اور نہایت عمدہ وسائلِ زندگی انھیں عطا کیے۔ پھر انھوں نے باہم اختلاف نہیں کیا مگر اُس وقت جب کہ علم اُن کے پاس آچکا تھا[95]۔ یقیناً تیرا رب قیامت کے روز

لاتا ہوں، اے خداوند! تیرے سوا کوئی خدا نہیں۔"

۹۲- آج تک وہ مقام جزیرہ نمائے سینا کے مغربی ساحل پر موجود ہے جہاں فرعون کی لاش سمندر میں تیرتی ہوئی پائی گئی تھی۔ اس کو موجودہ زمانے میں جبلِ فرعون کہتے ہیں، اور اسی کے قریب ایک گرم چشمہ ہے جس کو مقامی آبادی نے حمّامِ فرعون کے نام سے موسوم کر رکھا ہے۔ اس کی جائے وقوع ابوزنیمہ سے چند میل اُوپر شمال کی جانب ہے، اور علاقے کے باشندے اسی جگہ کی نشان دہی کرتے ہیں کہ فرعون کی لاش یہاں پڑی ہوئی ملی تھی۔

اگر یہ ڈوبنے والا وہی فرعون مِنفِتہ ہے جس کو زمانۂ حال کی تحقیق نے فرعونِ موسیٰ قرار دیا ہے تو اس کی لاش آج تک قاہرہ کے عجائب خانے میں موجود ہے۔ ۱۹۰۷ء میں سرگرافٹن الیٹ سمتھ نے اس کی ممّی پر سے جب پٹیاں کھولی تھیں تو اس کی لاش پر نمک کی ایک تہ جمی ہوئی پائی گئی تھی جو کھاری پانی میں اس کی غرقابی کی ایک کھلی علامت تھی۔

۹۳- یعنی ہم تو سبق آموز اور عبرت انگیز نشانات دکھائے ہی جائیں گے اگرچہ اکثر انسانوں کا حال یہ ہے کہ کسی بڑی سے بڑی عبرت ناک نشانی کو دیکھ کر بھی ان کی آنکھیں نہیں کھلتیں۔

۹۴- یعنی مصر سے نکلنے کے بعد ارضِ فلسطین۔

۹۵- مطلب یہ ہے کہ بعد میں انھوں نے اپنے دین میں جو تفرِقے برپا کیے اور نئے نئے مذہب نکالے اس کی وجہ یہ نہیں تھی کہ ان کو حقیقت کا علم نہیں دیا گیا تھا اور ناواقفیت کی بنا پر انھوں نے مجبوراً ایسا کیا، بلکہ فی الحقیقت یہ سب کچھ

بَيْنَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فِيْمَا كَانُوْا فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ ﴿۹۳﴾ فَاِنْ كُنْتَ فِيْ شَكٍّ مِّمَّآ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ فَسْـَٔلِ الَّذِيْنَ يَقْرَءُوْنَ الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكَ ۚ لَقَدْ جَآءَكَ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ فَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُمْتَرِيْنَ ﴿۹۴﴾ وَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ فَتَكُوْنَ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ﴿۹۵﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ حَقَّتْ عَلَيْهِمْ كَلِمَتُ رَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ ﴿۹۶﴾

اُن کے درمیان اُس چیز کا فیصلہ کردے گا جس میں وہ اختلاف کرتے رہے ہیں۔

اب اگر تجھے اُس ہدایت کی طرف سے کچھ بھی شک ہو جو ہم نے تجھ پر نازل کی ہے تو اُن لوگوں سے پوچھ لے جو پہلے سے کتاب پڑھ رہے ہیں۔ فی الواقع یہ تیرے پاس حق ہی آیا ہے تیرے رب کی طرف سے، لہٰذا تُو شک کرنے والوں میں سے نہ ہو اور ان لوگوں میں نہ شامل ہو جنھوں نے اللہ کی آیات کو جھُٹلایا ہے، ورنہ تُو نقصان اُٹھانے والوں میں سے ہوگا۔[96]

حقیقت یہ ہے کہ جن لوگوں پر تیرے رب کا قول راست آگیا ہے[97] ان کے سامنے خواہ کوئی نشانی

ان کے اپنے نفس کی شرارتوں کا نتیجہ تھا۔ خدا کی طرف سے تو انھیں واضح طور پر بتا دیا گیا تھا کہ دینِ حق یہ ہے، یہ اس کے اُصول ہیں، یہ اس کے تقاضے اور مطالبے ہیں، یہ کفر و اسلام کے امتیازی حُدُود ہیں، طاعت اس کو کہتے ہیں، مَعْصِیَت اِس کا نام ہے، اِن چیزوں کی باز پُرس خدا کے ہاں ہونی ہے، اور یہ وہ قواعد ہیں جن پر دُنیا میں تمھاری زندگی قائم ہونی چاہیے۔ مگر ان صاف صاف ہدایتوں کے باوجود انھوں نے ایک دین کے بیسیوں دین بنا ڈالے اور خدا کی دی ہوئی بنیادوں کو چھوڑ کر کچھ دوسری ہی بنیادوں پر اپنے مذہبی فرقوں کی عمارتیں کھڑی کرلیں۔

۹۶ – یہ خطاب بظاہر نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ہے مگر دراصل بات اُن لوگوں کو سُنانی مقصود ہے جو آپؐ کی دعوت میں شک کر رہے تھے۔ اور اہلِ کتاب کا حوالہ اس لیے دیا گیا ہے کہ عرب کے عوام تو آسمانی کتابوں کے علم سے بے بہرہ تھے، ان کے لیے یہ آواز ایک نئی آواز تھی، مگر اہلِ کتاب کے عُلَما میں سے جو لوگ مُتَدَیِّن اور منصف مزاج تھے وہ اس امر کی تصدیق کر سکتے تھے کہ جس چیز کی دعوت قرآن دے رہا ہے یہ وہی چیز ہے جس کی دعوت تمام پچھلے انبیا دیتے رہے ہیں۔

۹۷ – یعنی یہ قول کہ جو لوگ خود طالبِ حق نہیں ہوتے، اور جو اپنے دلوں پر ضد تعصب اور ہٹ دھرمی کے قفل چڑھائے

وَلَوْ جَآءَتْهُمْ كُلُّ اٰيَةٍ حَتّٰى يَرَوُا الْعَذَابَ الْاَلِيْمَ ﴿٩٧﴾ فَلَوْلَا كَانَتْ قَرْيَةٌ اٰمَنَتْ فَنَفَعَهَآ اِيْمَانُهَآ اِلَّا قَوْمَ يُوْنُسَ ۭ لَمَّآ اٰمَنُوْا كَشَفْنَا عَنْهُمْ عَذَابَ الْخِزْيِ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَمَتَّعْنٰهُمْ

آجائے، وہ کبھی ایمان لاکر نہیں دیتے جب تک کہ دردناک عذاب سامنے آتا نہ دیکھ لیں۔ پھر کیا ایسی کوئی مثال ہے کہ ایک بستی عذاب دیکھ کر ایمان لائی ہو اور اس کا ایمان اس کے لیے نفع بخش ثابت ہُوا ہو؟ یُونس ؑ کی قوم کے سوا[98] (اس کی کوئی نظیر نہیں)۔ وہ قوم جب ایمان لے آئی تھی تو البتہ ہم نے اس پر سے دُنیا کی زندگی میں رسوائی کا عذاب ٹال دیا[99] تھا اور اس کو ایک مدّت تک زندگی سے

رکھتے ہیں، اور جو دُنیا کے عشق میں مدہوش اور عاقبت سے بے فکر ہوتے ہیں، انھیں ایمان کی توفیق نصیب نہیں ہوتی۔

۹۸ – یونس علیہ السلام (جن کا نام بائبل میں یُوناہ ہے اور جن کا زمانہ ۸۶۰-۷۸۴ قبلِ مسیح کے درمیان بتایا جاتا ہے) اگرچہ اسرائیلی نبی تھے، مگر ان کو اَشُور (اَسیریا) والوں کی ہدایت کے لیے عراق بھیجا گیا تھا اور اسی بنا پر اَشُوریوں کو یہاں قوم یونس کہا گیا ہے۔ اس قوم کا مرکز اس زمانے میں نینویٰ کا مشہور شہر تھا جس کے وسیع کھنڈر آج تک دریائے دِجلہ کے مشرقی کنارے پر موجودہ شہر مَوصل کے عین مقابل پائے جاتے ہیں، اور اسی علاقے میں ''یونس نبی'' کے نام سے ایک مقام بھی موجود ہے۔ اس قوم کے عُروج کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ اس کا دار السّلطنت نینویٰ تقریباً ۶۰ میل کے دَور میں پھیلا ہُوا تھا۔

۹۹ – قرآن میں اس قصّے کی طرف تین جگہ صرف اشارات کیے گئے ہیں، کوئی تفصیل نہیں دی گئی (مُلاحظہ ہو: سورۂ انبیاء، آیات ۸۷-۸۸۔ الصّافّات، ۱۳۹-۱۴۸۔ القلم، ۴۸-۵۰)، اس لیے یقین کے ساتھ نہیں کہا جاسکتا کہ یہ قوم کن خاص وُجوہ کی بنا پر خدا کے اِس قانون سے مُستثنیٰ کی گئی کہ ''عذاب کا فیصلہ ہوجانے کے بعد کسی کا ایمان اس کے لیے نافع نہیں ہوتا''۔ بائبل میں ''یُوناہ'' کے نام سے جو مختصر سا صحیفہ ہے اس میں کچھ تفصیل تو ملتی ہے مگر وہ چنداں قابلِ اعتماد نہیں ہے۔ کیونکہ اوّل تو نہ وہ آسمانی صحیفہ ہے، نہ خود یونس علیہ السلام کا اپنا لکھا ہوا ہے، بلکہ ان کے چار پانچ سو برس بعد کسی نامعلوم شخص نے اسے تاریخِ یونس کے طور پر لکھ کر مجموعۂ کُتُبِ مقدّسہ میں شامل کر دیا ہے۔ دوسرے اس میں بعض صریح مُہملات بھی پائے جاتے ہیں جو ماننے کے قابل نہیں ہیں۔ تاہم قرآن کے اشارات اور صحیفۂ یونس کی تفصیلات پر غور کرنے سے وہی بات صحیح معلوم ہوتی ہے جو مفسرینِ قرآن نے بیان کی ہے کہ حضرت یونس ؑ چونکہ عذاب کی اِطّلاع دینے کے بعد اللہ تعالیٰ کی اجازت کے بغیر اپنا مستقر چھوڑ کر چلے گئے تھے، اس لیے جب آثارِ عذاب دیکھ کر اَشُوریوں نے توبہ واِستغفار کی تو اللہ تعالیٰ نے انھیں معاف کر دیا۔ قرآنِ مجید میں خدائی دستور کے جو اُصول و کُلّیات بیان کیے گئے ہیں، ان میں ایک مستقل دفعہ یہ بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی قوم کو اس وقت تک عذاب نہیں دیتا جب تک اس پر اپنی حُجّت پوری نہیں کر لیتا۔

اِلٰی حِیۡنٍ ﴿۹۸﴾ وَلَوۡ شَآءَ رَبُّکَ لَاٰمَنَ مَنۡ فِی الۡاَرۡضِ کُلُّهُمۡ جَمِیۡعًا ؕ اَفَاَنۡتَ تُکۡرِهُ النَّاسَ حَتّٰی یَکُوۡنُوۡا مُؤۡمِنِیۡنَ ﴿۹۹﴾ وَمَا کَانَ لِنَفۡسٍ

بہرہ مند ہونے کا موقع دے دیا تھا۔[100]

اگر تیرے رب کی مشیّت یہ ہوتی (کہ زمین میں سب مومن وفرماں بردار ہی ہوں) تو سارے اہلِ زمین ایمان لے آئے ہوتے۔[101] پھر کیا تو لوگوں کو مجبُور کرے گا کہ وہ مومن ہو جائیں؟[102] کوئی متنفّس اللہ

پس جب نبی نے اس قوم کی مہلت کے آخری لمحے تک نصیحت کا سلسلہ جاری نہ رکھا اور اللہ کے مقرر کردہ وقت سے پہلے بطورِ خود ہی وہ ہجرت کر گیا، تو اللہ تعالیٰ کے انصاف نے اس کی قوم کو عذاب دینا گوارا نہ کیا، کیونکہ اس پر اتمامِ حجت کی قانونی شرائط پوری نہیں ہوئی تھیں۔ (مزید تشریح کے لیے ملاحظہ ہو: تفسیر سورۂ الصّافّات، حاشیہ ۸۵)

۱۰۰ – جب یہ قوم ایمان لے آئی تو اس کی مہلتِ عمر میں اضافہ کر دیا گیا۔ بعد میں اس نے پھر خیال وعمل کی گمراہیاں اختیار کرنی شروع کر دیں۔ ناحُوم نبی (۷۲۰ – ۶۹۸ قبلِ مسیح) نے اسے متنبہ کیا، مگر کوئی اثر نہ ہُوا۔ پھر صَفنیاہ نبی (۶۴۰ – ۶۰۹ قبلِ مسیح) نے اس کو آخری تنبیہ کی۔ وہ بھی کارگر نہ ہوئی۔ آخرِ کار ۶۱۲ ق م کے لگ بھگ زمانے میں اللہ تعالیٰ نے میڈیا والوں کو اس پر مسلّط کر دیا۔ میڈیا کا بادشاہ بابل والوں کی مدد سے اَشُّور کے علاقے پر چڑھ آیا۔ اَشُّوری فوج شکست کھا کر نینویٰ میں محصور ہوگئی۔ کچھ مدّت تک اس نے سخت مقابلہ کیا۔ پھر دِجلہ کی طُغیانی نے فصیلِ شہر توڑ دی اور حملہ آور اندر گھس گئے۔ پورا شہر جلا کر خاک سیاہ کر دیا گیا۔ گرد وپیش کے علاقے کا بھی یہی حشر ہُوا۔ اَشُّور کا بادشاہ خود اپنے محل میں آگ لگا کر جل مرا، اور اس کے ساتھ ہی اَشُّوری سلطنت اور تہذیب بھی ہمیشہ کے لیے ختم ہوگئی۔ زمانۂ حال میں آثارِ قدیمہ کی جو کُھدائیاں اس علاقے میں ہوئی ہیں ان میں آتش زدگی کے نشانات کثرت سے پائے جاتے ہیں۔

۱۰۱ – یعنی اگر اللہ کی خواہش یہ ہوتی کہ اس کی زمین میں صرف اطاعت گزار وفرماں بردار ہی بسیں اور کفر ونافرمانی کا سرے سے کوئی وجود ہی نہ ہو تو اس کے لیے نہ یہ مشکل تھا کہ وہ تمام اہلِ زمین کو مومن ومطیع پیدا کرتا اور نہ یہی مشکل تھا کہ سب کے دل اپنے ایک ہی تکوینی اشارے سے ایمان واطاعت کی طرف پھیر دیتا۔ مگر نوعِ انسانی کے پیدا کرنے میں جو حکیمانہ غرض اس کے پیشِ نظر ہے، وہ اس تخلیقی وتکوینی جبر کے استعمال سے فوت ہو جاتی ہے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ خود ہی انسانوں کو ایمان لانے یا نہ لانے اور اطاعت اختیار کرنے یا نہ کرنے میں آزاد رکھنا چاہتا ہے۔

۱۰۲ – اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم لوگوں کو زبردستی مومن بنانا چاہتے تھے اور اللہ تعالیٰ آپؐ کو ایسا کرنے سے روک رہا تھا۔ دراصل اس فقرے میں وہی اندازِ بیان اختیار کیا گیا ہے جو قرآن میں بکثرت مقامات پر ہمیں ملتا ہے، کہ خطاب بظاہر تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ہوتا ہے مگر اصل میں لوگوں کو وہ بات سنانی مقصود ہوتی ہے جو نبی کو خطاب کر کے فرمائی جاتی ہے۔ یہاں جو کچھ کہنا مقصود ہے وہ یہ ہے کہ لوگو! حجت اور دلیل سے ہدایت وضلالت کا فرق کھول کر رکھ دینے اور راہِ راست

اَنۡ تُؤۡمِنَ اِلَّا بِاِذۡنِ اللّٰهِ ؕ وَيَجۡعَلُ الرِّجۡسَ عَلَى الَّذِيۡنَ لَا يَعۡقِلُوۡنَ ﴿۱۰۰﴾ قُلِ انْظُرُوۡا مَاذَا فِى السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ ؕ وَمَا تُغۡنِى الۡاٰيٰتُ وَالنُّذُرُ عَنۡ قَوۡمٍ لَّا يُؤۡمِنُوۡنَ ﴿۱۰۱﴾ فَهَلۡ

کے اِذن کے بغیر ایمان نہیں لاسکتا،[۱۰۳] اور اللہ کا طریقہ یہ ہے کہ جو لوگ عقل سے کام نہیں لیتے وہ ان پر گندگی ڈال دیتا ہے۔[۱۰۴]

اِن سے کہو: ”زمین اور آسمانوں میں جو کچھ ہے اسے آنکھیں کھول کر دیکھو۔“ اور جو لوگ ایمان لانا ہی نہیں چاہتے، ان کے لیے نشانیاں اور تنبیہیں آخر کیا مفید ہوسکتی ہیں[۱۰۵]۔ اب یہ لوگ اِس کے سوا

صاف صاف دکھا دینے کا جو حق تھا وہ تو ہمارے نبیؐ نے پورا پورا ادا کر دیا ہے۔ اب اگر تم خود راست رَو بننا نہیں چاہتے اور تمھارا سیدھی راہ پر آنا صرف اسی پر موقوف ہے کہ کوئی تمھیں زبردستی راہِ راست پر لائے تو تمھیں معلوم ہونا چاہیے کہ نبیؐ کے سُپرد یہ کام نہیں کیا گیا ہے۔ ایسا جبری ایمان اگر اللہ کو منظور ہوتا تو اس کے لیے اُسے نبیؐ بھیجنے کی ضرورت ہی کیا تھی، یہ کام تو وہ خود جب چاہتا کر سکتا تھا۔

۱۰۳ – یعنی جس طرح تمام نعمتیں تنہا اللہ کے اختیار میں ہیں اور کوئی شخص کسی نعمت کو بھی اللہ کے اِذن کے بغیر نہ خود حاصل کر سکتا ہے نہ کسی دوسرے شخص کو بخش سکتا ہے، اسی طرح یہ نعمت بھی کہ کوئی شخص صاحبِ ایمان ہو اور راہِ راست کی طرف ہدایت پائے، اللہ کے اِذن پر منحصر ہے۔ کوئی شخص نہ اس نعمت کو اذنِ الٰہی کے بغیر خود پا سکتا ہے، اور نہ کسی انسان کے اختیار میں یہ ہے کہ جس کو چاہے یہ نعمت عطا کر دے۔ پس نبی اگر سچے دل سے یہ چاہے بھی کہ لوگوں کو مومن بنا دے تو نہیں بنا سکتا۔ اس کے لیے اللہ کا اِذن اور اس کی توفیق درکار ہے۔

۱۰۴ – یہاں صاف بتا دیا گیا کہ اللہ کا اِذن اور اس کی توفیق کوئی اندھی بانٹ نہیں ہے کہ بغیر کسی حکمت اور بغیر کسی معقول ضابطے کے یوں ہی جس کو چاہا نعمتِ ایمان پانے کا موقع دیا اور جسے چاہا اس موقع سے محروم کر دیا۔ بلکہ اس کا ایک نہایت حکیمانہ ضابطہ ہے، اور وہ یہ ہے کہ جو شخص حقیقت کی تلاش میں بے لاگ طریقے سے اپنی عقل کو ٹھیک ٹھیک استعمال کرتا ہے، اس کے لیے تو اللہ کی طرف سے حقیقت رسی کے اسباب و ذرائع اس کی سعی وطلب کے تناسُب سے مہیا کر دیے جاتے ہیں، اور اسی کو صحیح علم پانے اور ایمان لانے کی توفیق بخشی جاتی ہے۔ رہے وہ لوگ جو طالبِ حق ہی نہیں ہیں اور جو اپنی عقل کو تعصُّبات کے پھندوں میں پھانسے رکھتے ہیں، یا سرے سے تلاشِ حقیقت میں اُسے استعمال ہی نہیں کرتے، تو اُن کے لیے اللہ کے خزانۂ قسمت میں جہالت اور گمراہی اور غلط بینی و غلط کاری کی نجاستوں کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ وہ اپنے آپ کو انھی نجاستوں کا اہل بناتے ہیں اور یہی ان کے نصیب میں

يَنْتَظِرُوْنَ اِلَّا مِثْلَ اَيَّامِ الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلِهِمْ ؕ قُلْ فَانْتَظِرُوْٓا اِنِّيْ مَعَكُمْ مِّنَ الْمُنْتَظِرِيْنَ ﴿۱۰۲﴾ ثُمَّ نُنَجِّيْ رُسُلَنَا وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كَذٰلِكَ ۚ حَقًّا عَلَيْنَا نُنْجِ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۱۰۳﴾ ع قُلْ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنْ كُنْتُمْ فِيْ شَكٍّ مِّنْ دِيْنِيْ فَلَآ اَعْبُدُ الَّذِيْنَ تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلٰكِنْ اَعْبُدُ اللّٰهَ الَّذِيْ يَتَوَفّٰىكُمْ ۖۚ وَاُمِرْتُ اَنْ اَكُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۱۰۴﴾

ع ۱۰ | ۱۵

اور کس چیز کے منتظر ہیں کہ وہی بُرے دن دیکھیں جو اِن سے پہلے گزرے ہوئے لوگ دیکھ چکے ہیں؟ اِن سے کہو: ”اچھا، انتظار کرو، میں بھی تمھارے ساتھ انتظار کرتا ہوں۔“ پھر (جب ایسا وقت آتا ہے تو) ہم اپنے رسُولوں کو اور اُن لوگوں کو بچا لیا کرتے ہیں جو ایمان لائے ہوں۔ ہمارا یہی طریقہ ہے۔ ہم پر یہ حق ہے کہ مومنوں کو بچا لیں۔ ع

اے نبیؐ! کہہ دو[۱۰۶] کہ لوگو! اگر تم ابھی تک میرے دین کے متعلّق کسی شک میں ہو تو سُن لو کہ تم اللہ کے سوا جن کی بندگی کرتے ہو میں ان کی بندگی نہیں کرتا، بلکہ صرف اسی خدا کی بندگی کرتا ہوں جس کے قبضے میں تمھاری موت ہے[۱۰۷]۔ مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں ایمان لانے والوں میں سے ہوں۔

لکھی جاتی ہیں۔

۱۰۵ — یہ ان کے اُس مطالبے کا آخری اور قطعی جواب ہے جو وہ ایمان لانے کے لیے شرط کے طور پر پیش کرتے تھے کہ ہمیں کوئی نشانی دکھائی جائے جس سے ہم کو یقین آجائے کہ تمھاری نبوت سچّی ہے۔ اس کے جواب میں فرمایا جا رہا ہے کہ اگر تمھارے اندر حق کی طلب اور قبولِ حق کی آمادگی ہو تو وہ بے حد وحساب نشانیاں جو زمین و آسمان میں ہر طرف پھیلی ہوئی ہیں، تمھیں پیغامِ محمدیؐ کی صداقت کا اطمینان دلانے کے لیے کافی سے زیادہ ہیں۔ صرف آنکھیں کھول کر انھیں دیکھنے کی ضرورت ہے۔ لیکن اگر یہ طلب اور یہ آمادگی ہی تمھارے اندر موجود نہیں ہے تو پھر کوئی نشانی بھی، خواہ وہ کیسی ہی خارقِ عادت اور عجیب و غریب ہو، تم کو نعمتِ ایمان سے بہرہ ور نہیں کر سکتی۔ ہر معجزے کو دیکھ کر تم فرعون اور اس کی قوم کے سرداروں کی طرح کہو گے کہ یہ تو جادوگری ہے۔ اس مرض میں جو لوگ مبتلا ہوتے ہیں ان کی آنکھیں صرف اُس وقت کُھلا کرتی ہیں جب خدا کا قہر و غضب اپنی ہولناک سخت گیری کے ساتھ اُن پر ٹوٹ پڑتا ہے، جس طرح فرعون کی آنکھیں ڈوبتے وقت کھلی تھیں۔ مگر عین گرفتاری کے موقع پر جو توبہ کی جائے اس کی کوئی قیمت نہیں۔

وَ اَنْ اَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّيْنِ حَنِيْفًا ۚ وَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ

اور مجھ سے فرمایا گیا ہے کہ تو یکسُو ہو کر اپنے آپ کو ٹھیک ٹھیک اِس دین پر قائم کر دے[108]، اور ہرگز ہرگز

۱۰۶ – جس مضمون سے تقریر کی ابتدا کی گئی تھی اسی پر اب تقریر کو ختم کیا جا رہا ہے۔ تقابُل کے لیے پہلے رُکوع کے مضمون پر پھر ایک نظر ڈال لی جائے۔

۱۰۷ – متن میں لفظ یَتَوَفّٰکُمْ ہے جس کا لفظی ترجمہ ہے: ''جو تمھیں موت دیتا ہے''۔ لیکن اس لفظی ترجمے سے اصل روح ظاہر نہیں ہوتی۔ اس ارشاد کی روح یہ ہے کہ ''وہ جس کے قبضے میں تمھاری جان ہے، جو تم پر ایسا مکمل حاکمانہ اقتدار رکھتا ہے کہ جب تک اس کی مرضی ہو اسی وقت تک تم جی سکتے ہو، اور جس وقت اس کا اشارہ ہو جائے اسی آن تمھیں اپنی جان اُس جان آفریں کے حوالے کر دینی پڑتی ہے، مَیں صرف اُسی کی پرستش اور اسی کی بندگی و غلامی اور اسی کی اطاعت و فرماں برداری کا قائل ہوں۔'' یہاں اتنا اور سمجھ لینا چاہیے کہ مشرکینِ مکّہ یہ مانتے تھے اور آج بھی ہر قسم کے مشرک یہ تسلیم کرتے ہیں کہ موت صرف اللہ ربّ العالمین کے اختیار میں ہے، اس پر کسی دوسرے کا قابو نہیں ہے۔ حتّٰی کہ جن بزرگوں کو یہ مشرکین خدائی صفات و اختیارات میں شریک ٹھیراتے ہیں، ان کے متعلق بھی وہ تسلیم کرتے ہیں کہ ان میں سے کوئی خود اپنی موت کا وقت نہیں ٹال سکا ہے۔ پس بیانِ مدّعا کے لیے اللہ تعالیٰ کی بے شمار صفات میں سے کسی دوسری صفت کا ذکر کرنے کے بجائے یہ خاص صفت کہ ''وہ جو تمھیں موت دیتا ہے'' یہاں اس لیے انتخاب کی گئی ہے کہ اپنا مسلک بیان کرنے کے ساتھ ساتھ اس کے صحیح ہونے کی دلیل بھی دے دی جائے۔ یعنی سب کو چھوڑ کر میں اُس کی بندگی اس لیے کرتا ہوں کہ زندگی و موت پر تنہا اسی کا اقتدار ہے۔ اور اس کے سوا دوسروں کی بندگی آخر کیوں کروں جب کہ وہ خود اپنی زندگی و موت پر بھی اقتدار نہیں رکھتے، کجا کہ کسی اور کی زندگی و موت کے مختار ہوں۔ پھر کمالِ بلاغت یہ ہے کہ ''وہ مجھے موت دینے والا ہے'' کہنے کے بجائے ''وہ جو تمھیں موت دیتا ہے'' فرمایا۔ اس طرح ایک ہی لفظ میں بیانِ مدّعا، دلیلِ مدّعا، اور دعوت الی المُدّعٰی، تینوں فائدے جمع کر دیے گئے ہیں۔ اگر یہ فرمایا جاتا کہ ''میں اس کی بندگی کرتا ہوں جو مجھے موت دینے والا ہے'' تو اس سے صرف یہی معنیٰ نکلتے کہ ''مجھے اس کی بندگی کرنی ہی چاہیے''۔ اب جو یہ فرمایا کہ ''میں اس کی بندگی کرتا ہوں جو تمھیں موت دینے والا ہے''، تو اس سے یہ معنیٰ نکلے کہ مجھے ہی نہیں، تم کو بھی اُسی کی بندگی کرنی چاہیے اور تم یہ غلطی کر رہے ہو کہ اس کے سوا دوسروں کی بندگی کیے جاتے ہو۔

۱۰۸ – اس مطالبے کی شدت قابلِ غور ہے۔ بات اِن الفاظ میں بھی ادا ہو سکتی تھی کہ تو ''اِس دین کو اختیار کر لے'' یا ''اِس دین پر چل'' یا ''اِس دین کا پیرو بن جا''۔ مگر اللہ تعالیٰ کو بیان کے یہ سب پیرایے ڈھیلے ڈھالے نظر آئے۔ اس دین کی جیسی سخت اور ٹُھکی اور کسی ہوئی پیروی مطلوب ہے، اس کا اظہار ان کمزور الفاظ سے نہ ہو سکتا تھا۔ لہٰذا اپنا مطالبہ ان الفاظ میں پیش فرمایا کہ اَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّيْنِ حَنِيْفًا – اَقِمْ وَجْهَكَ کے لفظی معنیٰ ہیں: ''اپنا چہرہ جما دے''۔ اس کا مفہوم یہ ہے کہ تیرا رُخ ایک ہی طرف قائم ہو۔ ڈگمگاتا اور ہلتا ڈُلتا نہ ہو۔ کبھی پیچھے اور کبھی آگے اور کبھی دائیں اور کبھی بائیں نہ مُڑتا رہے۔ بالکل ناک کی سیدھ اُسی راستے پر نظر جمائے ہوئے چل جو تجھے دکھا دیا گیا ہے۔ یہ بندش بجائے خود بہت چُست تھی، مگر اس پر بھی اکتفا نہ کیا گیا۔ اس پر ایک اور قید

الْمُشْرِكِيْنَ ﴿۱۰۵﴾ وَلَا تَدْعُ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَنْفَعُكَ وَلَا يَضُرُّكَ ۚ

مشرکوں میں سے[۱۰۹] نہ ہو۔ اور اللہ کو چھوڑ کر کسی ایسی ہستی کو نہ پکار جو تجھے نہ فائدہ پہنچا سکتی ہے نہ نقصان۔

حَنِیۡفًا کی بڑھائی گئی۔ حنیف اس کو کہتے ہیں جو سب طرف سے مڑ کر ایک طرف کا ہو رہا ہو۔ پس مطالبہ یہ ہے کہ اس دین کو، اِس بندگیِ خدا کے طریقے کو، اس طرزِ زندگی کو کہ پرستش، بندگی، غلامی، اطاعت، فرماں برداری سب کچھ صرف اللہ ربّ العالمین ہی کی کی جائے، ایسی یکسُوئی کے ساتھ اختیار کر کہ کسی دوسرے طریقے کی طرف ذرہ برابر مَیلان و رُجحان بھی نہ ہو، اس راہ پر آکر اُن غلط راہوں سے کچھ بھی لگاؤ باقی نہ رہے جنھیں تُو چھوڑ کر آیا ہے اور اُن ٹیڑھے راستوں پر ایک غلط انداز نگاہ بھی نہ پڑے جن پر دُنیا چلی جا رہی ہے۔

۱۰۹ – یعنی ان لوگوں میں ہرگز شامل نہ ہو جو اللہ کی ذات میں، اس کی صفات میں، اس کے حُقوق میں اور اس کے اختیارات میں کسی طور پر غیر اللہ کو شریک کرتے ہیں۔ خواہ وہ غیر اللہ ان کا اپنا نفس ہو، یا کوئی دوسرا انسان ہو، یا انسانوں کا کوئی مجموعہ ہو، یا کوئی روح ہو، جن ہو، فرشتہ ہو، یا کوئی مادّی یا خیالی یا وہمی وجود ہو۔ پس مطالبہ صرف اِس ایجابی صورت ہی میں نہیں ہے کہ توحیدِ خالص کا راستہ پوری استقامت کے ساتھ اختیار کر، بلکہ اِس سلبی صورت میں بھی ہے کہ ان لوگوں سے الگ ہو جا جو کسی شکل اور ڈھنگ کا شرک کرتے ہوں۔ عقیدے ہی میں نہیں عمل میں بھی، انفرادی طرزِ زندگی ہی میں نہیں اجتماعی نظامِ حیات میں بھی، مَعبَدوں اور پرستش گاہوں ہی میں نہیں درس گاہوں میں بھی، عدالت خانوں میں بھی، قانون سازی کی مجلسوں میں بھی، سیاست کے اَیوانوں میں بھی، معیشت کے بازاروں میں بھی، غرض ہر جگہ اُن لوگوں کے طریقے سے اپنا طریقہ الگ کر لے جنھوں نے اپنے افکار و اعمال کا پورا نظام خدا پرستی اور ناخدا پرستی کی آمیزش پر قائم کر رکھا ہے۔ توحید کا پیرو زندگی کے کسی پہلو اور کسی شعبے میں بھی شرک کی راہ چلنے والوں کے ساتھ قدم سے قدم ملا کر نہیں چل سکتا، کجا کہ آگے وہ ہوں اور پیچھے یہ، اور پھر بھی اس کی توحید پرستی کے تقاضے اطمینان سے پورے ہوتے رہیں!

پھر مطالبہ شرکِ جلی ہی سے پرہیز کا نہیں ہے بلکہ شرکِ خفی سے بھی کامل اور سخت اجتناب کا ہے۔ بلکہ شرکِ خفی زیادہ خوف ناک ہے اور اس سے ہوشیار رہنے کی اور بھی زیادہ ضرورت ہے۔ بعض نادان لوگ ”شرکِ خفی“ کو ”شرکِ خفیف“ سمجھتے ہیں اور ان کا گمان یہ ہے کہ اس کا معاملہ اتنا اہم نہیں ہے جتنا شرکِ جلی کا ہے۔ حالاں کہ خفی کے معنیٰ خفیف کے نہیں ہیں، پوشیدہ و مستور کے ہیں۔ اب یہ سوچنے کی بات ہے کہ جو دشمن منہ کھول کر دن دہاڑے سامنے آجائے وہ زیادہ خطرناک ہے، یا وہ جو آستین میں چھپا ہُوا ہو یا دوست کے لباس میں معانقہ کر رہا ہو؟ بیماری وہ زیادہ مہلک ہے جس کی علامات بالکل نمایاں ہوں، یا وہ جو مدتوں تک تندرستی کے دھوکے میں رکھ کر اندر ہی اندر صحت کی جڑ کھوکھلی کرتی رہے؟ جس شرک کو ہر شخص بیک نظر دیکھ کر کہہ دے کہ یہ شرک ہے، اُس سے تو دینِ توحید کا تصادُم بالکل کُھلا ہوا ہے۔ مگر جس شرک کو سمجھنے کے لیے گہری نگاہ اور مُقتضیاتِ توحید کا عمیق فہم درکار ہے، وہ اپنی غیر مرئی جڑیں دین کے نظام میں اس طرح پھیلاتا ہے کہ عام اہلِ توحید کو ان کی خبر تک نہیں ہوتی اور رفتہ رفتہ ایسے غیر محسوس طریقے سے دین کے مغز کو کھا جاتا ہے کہ کہیں خطرے کا الارم بجنے کی نوبت ہی نہیں آتی۔

فَاِنْ فَعَلْتَ فَاِنَّكَ اِذًا مِّنَ الظّٰلِمِیْنَ ﴿۱۰۶﴾ وَ اِنْ یَّمْسَسْكَ اللّٰهُ بِضُرٍّ فَلَا كَاشِفَ لَهٗۤ اِلَّا هُوَ ۚ وَ اِنْ یُّرِدْكَ بِخَیْرٍ فَلَا رَآدَّ لِفَضْلِهٖ ؕ یُصِیْبُ بِهٖ مَنْ یَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ ؕ وَ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِیْمُ ﴿۱۰۷﴾ قُلْ یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَكُمُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكُمْ ۚ فَمَنِ اهْتَدٰى فَاِنَّمَا یَهْتَدِیْ لِنَفْسِهٖ ۚ وَ مَنْ ضَلَّ فَاِنَّمَا یَضِلُّ عَلَیْهَا ۚ وَ مَاۤ اَنَا عَلَیْكُمْ بِوَكِیْلٍ ﴿۱۰۸﴾ وَ اتَّبِعْ مَا یُوْحٰۤى اِلَیْكَ وَ اصْبِرْ حَتّٰى یَحْكُمَ اللّٰهُ ۚۖ وَ هُوَ خَیْرُ الْحٰكِمِیْنَ ﴿۱۰۹﴾ ع

اگر تُو ایسا کرے گا تو ظالموں میں سے ہوگا۔ اگر اللہ تجھے کسی مصیبت میں ڈالے تو خود اس کے سوا کوئی نہیں جو اس مصیبت کو ٹال دے، اور اگر وہ تیرے حق میں کسی بھلائی کا ارادہ کرے تو اس کے فضل کو پھیرنے والا بھی کوئی نہیں ہے۔ وہ اپنے بندوں میں سے جس کو چاہتا ہے اپنے فضل سے نوازتا ہے اور وہ درگزر کرنے والا اور رحم فرمانے والا ہے۔

اے محمدؐ! کہہ دو کہ ”لوگو! تمھارے پاس تمھارے رب کی طرف سے حق آ چکا ہے۔ اب جو سیدھی راہ اختیار کرے اس کی راست روی اسی کے لیے مفید ہے، اور جو گمراہ رہے اس کی گمراہی اسی کے لیے تباہ کُن ہے۔ اور میں تمھارے اُوپر کوئی حوالہ دار نہیں ہوں۔“ اور اے نبیؐ! تم اس ہدایت کی پیروی کیے جاؤ جو تمھاری طرف بذریعۂ وحی بھیجی جا رہی ہے، اور صبر کرو یہاں تک کہ اللہ فیصلہ کر دے، اور وہی بہترین فیصلہ کرنے والا ہے۔ ع